# کسی اور زمانے کا خواب

## بقا اور ترقی کے لئے لائحہ عمل

بیرسٹر ظفراللہ خان

# کسی اور زمانے کا خواب

## بقا اور ترقی کیلئے لائحہ عمل

بیرسٹر ظفر اللہ خان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب: کسی اور زمانے کا خواب
طبع اول: نومبر 2004
مطبوعہ: پرنٹ سٹائل، پوٹھوہار پلازہ، بلیو ایریا اسلام آباد۔ فون:2270432
ناشر: سحر، اسٹیٹ لائف بلڈنگ نمبر 7، بلیو ایریا اسلام آباد۔ فون:2878075-8

# فہرست

## چوتھا باب



## پانچواں باب

## چھٹا باب



## ساتواں باب

# آراء

ڈاکٹر محمود احمد غازی

میاں اللہ نواز

ارشاد احمد حقانی

جاوید احمد غامدی

ڈاکٹر خالد محمود

بیرسٹر ظفر اللہ خان صاحب اپنی نوعیت کے ایک منفرد انسان ہیں ۔قرآن مجید سے گہرا شغف ، اسلامی علوم وفنون سے براہِ راست واقفیت ، دعوۃ وتبلیغ کا شوق ، اُمت مسلمہ کے مستقبل کی گہری فکر ، قانون اور دستور ہر وقت کا اوڑھنا بچھونا ، انتظامی امور سے براہِ راست تعلق اور ان سب سے بڑھ کر شعر وادب اور تصنیف وتالیف کا گہرا ذوق ، یہ سب چیزیں اس مختصر سے وجود میں بیک وقت جمع ہیں ۔ظفر اللہ خان صاحب کی مختلف سرگرمیوں میں ان متنوع جہتوں کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے ۔زیرِ نظر کتاب دراصل ایک تقریر ہے جو انہوں نے دعوۃ اکیڈمی ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں علمائے کرام کے سامنے کی تھی انہوں نے اس تقریر میں انتہائی دردمندی سے مسلمانوں کو درپیش چیلنجوں کا جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ مسلمان مشکلات کے اس دور سے کیسے نکل سکتے ہیں ۔

جناب ظفر اللہ خان صاحب کے نزدیک جہالت ، غربت ، کمزوری اور دین کی غلط فہمی ، اس وقت مسلمانوں کے سب سے بڑے مصائب ہیں ۔انہوں نے کتاب کے پانچویں باب میں ان چاروں مسائل پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے ۔کتاب کا چھٹا باب دراصل وہ دستورِ عمل ہے جو فاضل مصنف کے نزدیک اُمت مسلمہ کو اختیار کرنا چاہیے ۔ یہاں مصنف نے ایک بارہ نکاتی لائحہ عمل تجویز کیا ہے ۔اس لائحہ عمل کے بنیادی نکات اور اساسی تصورات سے کلی اختلاف کسی کو بھی نہیں البتہ ترجیحات اور تفصیلات کے بارے میں ایک سے زائد آراء ہوسکتی ہیں ۔ دراصل یہی بات کتاب کی جان ہے ۔ بقیہ مختصر ابواب اس بات کی تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

مصنف کو اُمت مسلمہ کی حالت زار پر جو گہرا دُکھ ہے اس کا اظہار کتاب کے صفحے صفحے سے ہوتا ہے ۔اس شدتِ احساس نے کہیں کہیں تلخ بیانی کا انداز اپنالیا ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے قارئین اس تلخ نوائی کو معاف فرمائیں گے ۔

چمن میں تلخ نوائی میری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریا کی

ڈاکٹر محمود احمد غازی
صدر، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد
سابق وفاقی وزیر برائے مذہبی امور حکومت پاکستان

اسلام آباد
یکم اکتوبر ۲۰۰۴

میں لکھاری ہوں اور نہ ہی بڑا عالم کہ کسی کے تخلیق کے متعلق اپنے رائے دے سکوں، پھر بھی بیرسٹر ظفر اللہ خان کا اصرار ہے کہ میں انکے تفصیلی لیکچر پر کچھ نہ کچھ کہوں۔

ظفر اللہ خان بیرسٹر بھی ہیں اور سی ایس پی بھی۔ اپنی سیمابی جبلتوں کی وجہ سے انہوں نے دامن پیشہ وکالت میں پناہ لی ہے۔ وہ راسخ العقیدہ مسلمان ہیں جو اسلام کے معاشی نظام، اخلاقی نظام اور جزا وسزا کے اصولوں پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ شروع سے لیکر آج تک انہوں نے غیر قانونیت، ناانصافی اور افسر شاہی کی فرعونیت کے خلاف جدوجہد کی ہے۔ انہوں نے اپنے سرکاری ملازمت کے دور میں اعلیٰ آفیسروں کے غیر قانونی اور ظالمانہ احکامات کے خلاف ہمیشہ دلیری سے نہ صرف بغاوت کی ہے بلکہ انکے احکامات کی تکمیل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس باغیانہ رویے کو غلام گردش نظام نے قبول نہیں کیا۔ آج وہ پر آسائش ملازمت کی وادی سے نکل کر قانون کے خاردار میدان میں اپنے جوہر دکھا رہے ہیں۔ یہ لیکچر بھی انکی عادتیں اور فطری جبلتوں کا عملی شاہکار ہے۔

پوری محنت سے، پورے خلوص سے، پورے یقین سے انہوں نے امتِ اسلامیہ کی حالت اور مصائب کا رنج وکرب کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ انکے خیالات سے مفر ممکن نہیں ہے۔ آج ملت اسلامیہ جن وجوہات کی بنیاد پر زوال پذیر ہے، وہ بالکل روز روشن کی طرح ہم پر واضح ہیں۔ آج ہمارے پاس علم ہے نہ تحقیق اور نہ ہی حکومت میں شورائیت کا کہیں وجود ہے۔ آج ہم دنیا میں بغیر کسی وجود کے ہیں بلکہ مغربی قوتوں کے کاسہ لیس ہیں۔

ایک چیز جسکا میں اضافہ کرنا چاہوں گا وہ یہ ہے کہ سچائی اور جھوٹ، عدل اور ظلم، یہ انسانی فطری جبلتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ انسان خالقِ کائنات کی ایک عجیب اور پیچیدہ شاہکار تخلیق ہے۔ انسان میں بیک وقت نفرت اور پیار، ظلم اور رحم، لالچ اور قربانی، دوسروں کے حقوق غصب کرنے کی خواہش اور دوسروں کو حق دلانے کی خواہش، اس طرح کی کروڑوں متضاد جبلتیں موجود ہیں۔ تخلیق آدم سے اب تک ان جبلتوں کی آپس میں نہ ختم ہونے والی لڑائی سے دنیا کی تاریخ میں بربریت کی عمل

داری رہی ہے۔ مجھے ایسے لگتا ہے کہ اس ناختم ہونے والی جدوجہد میں انصاف قائم کرنے والی قوتیں ناکامیاب اور نامراد رہی ہیں۔ چنگیز خان، ہٹلر اور مغربی سامراج ان حقائق کا واضح ثبوت ہیں۔

رسول عربی کی امت کی کہانی علم کی کہانی ہے، پیار کی کہانی ہے، محبت کی کہانی ہے، اس نظام میں شورائیت، کلیدی اہمیت کی حامل ہے۔ بغیر شورائیت کے اسلام کا نظام معیشت، اسلامی مساوات کے اصول اور نہ ہی اسلام کی بنیادی انسانی عظمت کا حکم سرخرو ہوسکتا ہے۔ اسلام کے محبت کے اصول، انسانی مساوات کے اصول، بنیادی حقوق کے اصول، معاشیات کے اصول کبھی بھی ملوکیت اور آمریت کے نظام میں قائم ہو سکتے ہیں اور نہ ہی پرورش پا سکتے ہیں۔

میں بیرسٹر ظفر اللہ خان کی زوالِ امت سے متعلق اخذ کردہ وجوہات سے پوری طرح متفق ہوں۔ خداوند کریم ان کو علم کی دولت سے مزید مالا مال کرے تا کہ وہ پوری قوت سے اپنے مشن کو جاری رکھیں اور امت کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کیلئے کام کرسکیں۔

میاں اللہ نواز

سابق چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ

ایڈووکیٹ سپریم کورٹ

لاہور

۲۹ اکتوبر ۲۰۰۴

مجھے بیرسٹر ظفر اللہ خان کی کتاب 'کسی اور زمانے کا خواب' جستہ جستہ دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میری رائے ہے کہ اس کتاب میں مسلمانوں کو جگانے، بیدار کرنے بلکہ خواب غفلت سے جھنجھوڑ کر ہوش میں لانے کی ایک سنجیدہ علمی کوشش کی گئی ہے۔ ظفر اللہ خان صاحب نے امہ کو درپیش فکری اور علمی چیلنجوں کا بڑا عمدگی سے احاطہ کیا ہے اور ان کا کامیاب جواب دینے کی نہ صرف ضرورت واضح کی ہے بلکہ اس کا طریق کار بھی کھول کر بیان کیا ہے۔ مصنف کی یہ تشخیص مبنی برصداقت ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا بنیادی سبب صدیوں سے ان پر چھایا ہوا فکری جمود ہے اور جب تک وہ اس سے نجات نہیں پاتے ان کی ہمہ جہت پسماندگی دور ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

مصنف نے اسلامی تعلیمات کو دوبارہ سمجھنے اور ان کی تعبیر نو کرنے کی ضرورت پر جو زور دیا ہے اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مصنف کی راہنمائی کے مآخذ قرآن وسنت اور بڑی حد تک اقبالؔ کے افکار ہیں۔ کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے میں نثر میں 'مسدس حالی' کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ وہ بھی ایک کوشش تھی مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور انہیں نئے زمانے کے تقاضوں کی معرفت حاصل کرنے پر آمادہ کرنے کی۔ قرآن نے مسلمانوں کو کائنات پر تدبر کرنے کی جو بار بار تاکید کی ہے مصنف نے اسے خوبصورت پیرائے میں اور جدید انداز میں واضح کیا ہے۔ معیشت، سیاست، ثقافت کے موضوعات پر مصنف نے جو کچھ کہا ہے اس میں مجھے ان کے راسخ فکری شعور کی جھلک نمایاں طور پر دکھائی دی ہے اور میں نے ان کے فہم اسلام کو اپنے فہم اسلام کے بہت قریب پایا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان سکالر کی ذمہ داری بھی اور پہچان بھی یہ بتائی ہے کہ 'اَنْ یکونَ بصیراً بزمانہ' یعنی ایک مسلمان عالم کی یہ ذمہ داری بھی ہے اور پہچان بھی کہ وہ اپنے عہد کی بنیادی حقیقتوں سے آگاہ ہوتا ہے اور اسلام کو سمجھنے کی کوشش کے دوران وہ اپنے زمانے کے حقائق کو پیش نظر رکھتا ہے۔

اقبالؔ نے فقہ اسلامی کی تعبیر نو کی ضرورت بیان کرتے ہوئے 'دوام فی التغیّر' کے اصول پر بہت زور دیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ دین کی اساسی تعلیمات کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق احکام اسلام کی تعبیر کیا جائے۔ اسی کا نام اجتہاد ہے اور یہ بات بالکل درست ہے کہ

اجتہاد کا راستہ ترک کرنے کی وجہ سے مسلمان فکری پسماندگی اور عملی زوال کا شکار ہوئے ہیں۔اب بھی انہیں اگر اپنی عظمت رفتہ کو حاصل کرنا ہے اور دنیا میں عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہنا ہے تو انہیں قرآن کی تعلیمات کو مجتہدانہ سوچ کے ساتھ پڑھنا اور سمجھنا ہوگا ورنہ آج کی طرح ذلت و نکبت ہی ان کا مقدر رہے گی۔

عالم اسلام کی تمام تر زبوں حالی کے باوجود ایسے اشارے موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملت اسلامیہ صدیوں پر محیط خواب خرگوش سے کچھ کچھ بیدار ہو رہی ہے۔اسے نئے حقائق کا ادراک ہو رہا ہے اور وہ نئے چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے کی فکری علمی اور عملی تیاری کر رہی ہے۔میری یہ رائے ممکن ہے بعض لوگوں کو درست دکھائی نہ دے لیکن مجھے اس کی صداقت پر پورا یقین ہے اور میرا خیال ہے کہ 21 ویں صدی جوں جوں آگے بڑھے گی عالم اسلام میں شعور اور بیداری کی لہریں تقویت پکڑیں گی اور وہ اپنی عظمت رفتہ کے حصول کی منزل کی طرف قدم بقدم آگے بڑھے گا۔اس سفر میں بیرسٹر ظفر اللہ خان کی زیر نظر تصنیف اور اس جیسی دیگر کتابیں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔میری خواہش ہے کہ اس کتاب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ممکن ہو سکے بالخصوص جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں، کالجوں اور جامعات کے طلبا و طالبات، وکلا، علما اور عام مسلمان دانشور طبقے کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔یہ کتاب انہیں سوچ کے نئے زاویے اور بیداری کا پیغام دے گی۔میں یہ کتاب تحریر کرنے پر بیرسٹر ظفر اللہ خان کی تحسین کرتا ہوں۔

ارشاد احمد حقانی

سینئر ایڈیٹر روزنامہ جنگ

لاہور

۱۲ اکتوبر ۲۰۰۴ء

دین کی حقیقت کیا ہے؟ مسلمان اسے غزالی سے سمجھتے ہیں یا ابن تیمیہ سے یا ابوالاعلیٰ مودودی سے۔ غزالی کی تعبیر پر تصوف کا غلبہ ہے۔ ابن تیمیہ کے ہاں دینی تصورات متفرقات کی صورت میں سامنے آتے ہیں، ان کی باہمی نسبتیں دریافت کرنا ان کے پیش نظر ہی نہیں ہوتا۔ ابوالاعلیٰ مودودی دین کو ایک نظام کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور مسلمانوں کی زندگی کا مقصد وحید یہی قرار دیتے ہیں کہ اس نظام کا غلبہ سیاسی لحاظ سے پوری دنیا پر قائم کر دیا جائے۔

یہ تینوں نقطہ ہائے نظر دین کے حقیقی تصور سے کس قدر قریب یا کتنی دور ہیں اور مسلمانوں کے علم وعمل پر ان کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں؟

**یہ پہلا سوال ہے**

ہماری تہذیب کیا ہے؟ اس کے مظاہر جو کچھ بھی رہے ہوں، یہ حقیقت ہے کہ اس کی بنیادی قدر حیا اور حفظ مراتب ہے۔ یہ قدر ہمیں اتنی زیادہ عزیز رہی ہے کہ اس کیلئے ہم اپنی ہر چیز قربان کرنے کیلئے تیار ہو جاتے تھے۔ ہماری زبان، لباس، رہن سہن، رسم ورواج، سیاست، معیشت، معاشرت اور تعلیم وتعلم، غرض ہر چیز پر صدیوں اس کی حکومت رہی ہے۔ اس کے مقابلے مین مغربی تہذیب ہے جس کی بنیادی قدر آزادی ہے اور بالکل اسی طریقے سے اس کی ہر چیز پر حکومت کر رہی ہے، جس طرح حیا اور حفظ مراتب کی قدر ہماری تہذیب میں حکومت کرتی رہی ہے۔

اب کیا کیا جائے؟ اپنی اقدار کی طرف مراجعت کی جائے اور انہیں مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا جائے یا آگے بڑھ کر آزادی کے اس تصور کا خیر مقدم کیا جائے جو جدید ذرائع ابلاغ کی طاقت سے اس وقت پوری قوت سے ہماری طرف پیش قدمی کر رہا ہے؟

**یہ دوسرا سوال ہے**

مسلمان کہتے ہیں کہ ان کی عظمت کا راز جذبۂ جہاد میں ہے اور جہاد سے وہ بالعموم قتال مراد لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ صدیوں پہلے جب وہ عالمی طاقت بنے تھے تو ان کا یہ مقام اسی جذبے کا

مرہون منت تھا اور اب بھی اگر دنیا میں انہیں کبھی سرفرازی حاصل ہوئی تو اسی جہاد و قتال کے ذریعے سے حاصل ہوگی۔ ٹیپو سلطان، بخت خان، سید احمد شہید، امام شامل، مہدی سوڈانی اور ملا عمر جیسے مجاہدین ان کے ہیرو ہیں اور ان کے اقدامات کی پے در پے ناکامی کے باوجود وہ اب بھی منتظر ہیں کہ انھی کی طرح کوئی مہدی مدعو د آئے گا اور کافروں سے جہاد کر کے دنیا کی حکومت ان کے حوالے کر دے گا۔ یہ نقطۂ نظر صحیح ہے یا اس کے برخلاف مسلمانوں کے زوال کا باعث قرآن سے ان کی بے تعلقی، اجتہاد سے گریز اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے بجائے فلسفہ و تصوف سے ان کے ذہین عناصر کا غیر معمولی اشتغال ہے؟

## یہ تیسرا سوال ہے

برادرم ظفر اللہ خاں نے یہ کتاب انھی سوالات کے پس منظر میں لکھی ہے۔ ان کی آرا سے آپ اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن اس بات سے اختلاف نہیں کر سکتے کہ یہ فی الواقع ایک دل دردمند کی صدا ہے۔ کیا حرج ہے کہ جذبات و تعصبات کو تھوڑی دیر کیلئے ایک طرف رکھ کر ان کی یہ صدا بھی سن لی جائے:

خطا کہیں تو ہوئی ہے اسے بھی ذرا دیکھ
نہیں ہے مرد مسلماں اگر جلیل و جمیل

جاوید احمد غامدی

المورد، لاہور
۲۰ اکتوبر ۲۰۰۴

بیرسٹر ظفر اللہ خان ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، باصلاحیت، وضع دار اور صالح نوجوان ہیں۔ قدیم اور جدید علوم سے آراستہ ہیں، بلکہ آپ میں دونوں کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ خوش پوشاک، خوش گفتار اور خوش اخلاق ہیں۔ ہر ہر چیز میں نستعلیقیت اور نفاست کا اظہار ہوتا ہے۔ اعلیٰ علمی اور ادبی ذوق کے مالک ہیں، پہلو میں ایک دردمند دل رکھتے ہیں اور مسلم امہ کی ترقی کیلئے تڑپتے رہتے ہیں۔

آپ اندرون اور بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں میں تحصیل علم کے باوجود اپنی قدیم روایات، ثقافت اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کے پاسدار ہیں۔ آپ نے سول سروس سے قبل از وقت فارغ ہو کر ایک بروقت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ آپ نے یہ فیصلہ کر کے اپنی خداداد صلاحیتوں اور ذہانت کو ایک طرح سے ضائع ہونے سے بچا لیا ہے۔

اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات اور دوسری علمی و ادبی سرگرمیوں سے وقت نکال کر تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دی ہے اس میدان میں اُن کا یہ قدم خوش آئند ہے اس سے قبل ان کی ایک کتاب Human Rights منظر عام پر آ چکی ہے حقوقِ انسانی کے موضوع پر اپنی نوعیت کی یہ واحد کتاب ہے جو بڑی مفید اور جامع ہے علمی حلقوں میں اس کو کافی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔

بیرسٹر ظفر اللہ خان کے بارے میں سب سے بڑی اہم بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فکر صحیح سے نوازا ہے۔ فکر صحیح وہ نعمت ہے جو شاید ہی کسی کو نصیب ہوتی ہے اور اگر مل جائے تو زندگی کی گھتیاں سلجھتی چلی جاتی ہیں۔ آپ کی تازہ تصنیف اسی فکرِ صحیح کا نتیجہ ہے۔

راقم الحروف کی ایک عرصہ سے خواہش تھی کہ کوئی اللہ کا نیک بندہ اس موضوع پر قلم اٹھائے۔ راقم الحروف نے محدود پیمانے پر نجی محفلوں میں لیکچرز اور مضامین کے ذریعے اندرون اور بیرون ملک اس موضوع کے بعض پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس موضوع پر ایک بھرپور اور جامع کتاب کی ضرورت تھی۔ جس کیلئے بڑی جرأت مندی، حوصلہ اور بصیرت کی ضرورت تھی۔

ہمارے ملک کے علماء کرام، دانشوروں اور سکالرز کا یہ فرض تھا کہ وہ اُمت مسلمہ کو ان خطرات سے آگاہ کر کے اُن کی رہنمائی کرتے جبکہ اس دور میں بڑے بڑے جفادری لکھنے اور بولنے والے منقارزیر پر رہے۔ خاموشی ہی کو مصلحت سمجھا۔ کسی نے بھی اس سطح پر اجتماعی محاسبہ کی طرف توجہ نہیں دلائی۔ جو قومیں انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے محاسبے اور مثبت تنقید کو برداشت نہیں کرتیں وہ ایسی مہلک اخلاقی بیماریوں کا شکار ہو جاتی ہیں جو بالآخر اُن کی ہلاکت کا باعث بنتی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں مصنف نے بڑی جراُت مندی اور بصیرت سے اُمت مسلمہ کے حالات کا تجزیہ کیا ہے اور غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ صرف نشاندہی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ اُن کے علاج کیلئے تجاویز پیش کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے مسلم دنیا کو جھنجھوڑا ہے۔ احساس دلایا ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اس کتاب میں بعض مقامات پر مصنف نے بڑی فکر انگیز اور بصیرت افروز باتیں کی ہیں جو قارئین کو دعوت فکر و عمل دیتی ہیں۔ یہ ایک قابل ستائش کاوش ہے۔ جس کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں۔

یہ بات حقیقت ہے کہ آج دین کی تشریح و تفہیم اور دعوت کا کام وہ لوگ بہتر طور پر کر سکتے ہیں جو عصری علوم، پبلک لائف اور عملی زندگی کے نشیب و فراز اور تجربات سے آراستہ ہو کر دین کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس سے وسعتِ قلب و نظر پیدا ہوتی ہے جو دین کی تفہیم اور اجتہاد کیلئے بہت ضروری ہے۔ راقم الحروف اپنے اس تبصرے کو مصنف کے ان الفاظ پر ختم کرتا ہے:۔

'ہمیں چاہیے کہ اپنی فکر کو صحیح کریں جب تک یہ فکر صحیح نہیں ہوگی ہم ترقی نہیں کر سکتے'

پروفیسر ڈاکٹر خالد محمود
اقراء انٹرنیشنل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن امریکہ

# ابتدائیہ

دس ہزار میل دور سے آنے والی دیوہیکل بلاؤں نے ہزار ہزار ٹن وزنی بم گرائے۔ غاروں میں چھپے نہتے اور بھوکے پیاسے افغان غاروں میں دفن ہو گئے۔ بارود کی شدت اور قتل و غارت کے غم میں تورا بورا کے پہاڑ سیاہ ہو گئے۔ مزار شریف سے ہزاروں لوگ گرفتار کئے گئے کچھ لوہے کے کینٹینروں میں بند کئے گئے جہاں وہ پیاس سے بلک بلک کر مر گئے۔ جو بچ گئے ان کو ایک قلعہ میں لایا گیا اور پھر انہیں ذبح کر دیا گیا۔ شادی کی تقریب میں بچے اکھٹے ہو کر کھیل رہے تھے۔ انہیں بم مار کر ہمیشہ کیلئے سلا دیا گیا شاید بڑے ہو کر طالبان نہ بن جائیں۔

ابوغریب کی جیل میں قیدیوں کو ننگا کیا گیا۔ ان کی جنسی تذلیل کی گئی۔ اہلِ روم کی یاد میں ان پر کتے چھوڑے گئے۔ خواتین سے درندگی کی گئی۔ وہ ''یا حجاج یا حجاج'' پکارتی رہیں لیکن حجاز تک کے حجاج ان کی چیخ و پکار نہ سن سکے۔ طالبان بے عقل تھے۔ صدام ظالم تھا۔ لیکن معصوم افغانی و عراقی تو بے گناہ تھے۔

یہ واقعات مجھے 1258ء/686ھ کا بغداد یاد دلاتے ہیں۔ بغداد میں چالیس روز تک قتل و غارت ہوتی رہی۔ دنیا کا خوبصورت ترین شہر ویران ہو گیا۔ راستوں اور بازاروں میں لاشوں کے ڈھیر تھے، جو ٹیلے نظر آتے تھے۔ ان لاشوں پر بارش ہوئی تو صورتیں بگڑ گئیں۔ سارے شہر میں تعفن پھیلا جس سے سخت وبا پھیلی جس کا اثر ملک شام تک پہنچا۔ (البدایہ والنہایہ) ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ اے کاش میں اس واقعہ سے پہلے مر چکا ہوتا۔ یہ حادثہ عظمیٰ ہے۔ مصیبت کبریٰ ہے دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی (الکامل۔ جلد 13۔ صفحہ 202)

فتنہ تاتار اور آج کے حالات میں مماثلت ہے۔ دونوں اسلام کیلئے بلائیں ثابت ہوئیں۔ دونوں نے دنیائے اسلام کی چولیں ہلا دیں۔ مسلمان حیران ہیں، خوف و ہراس میں ہیں، صدمے میں ہیں، یاس میں ہیں۔

مسئلہ یہ نہیں کہ کیا ہوا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ کیوں ہوا ہے؟ اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ ہم بالکل ٹھیک ہیں اور مغرب اسلام کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ غلطی ہماری ہے۔ ہم کمزور ہیں۔ بے حکمت ہیں۔ میری رائے میں پہلا جواب بھی بالکل غلط نہیں ہے لیکن اصل مسئلہ ہمارے اندر ہے۔ ہم نے اپنی اور اسلام کی شکل بگاڑ دی ہے۔ ہم ماضی میں رہتے ہیں۔ غاروں کے قابل تو ہیں مگر اکیسویں صدی کیلئے تیار نہیں۔

ہم سب اس کے ذمہ دار ہیں۔ عام مسلمان بھی، اہل اقتدار بھی، اور علماء بھی، میری رائے میں سب سے زیادہ قصور وار اہل دین ہیں جو دین سے بے خبر ہیں مقام محمدؐ سے بے خبر ہیں۔ اہل اقتدار بھی اہل ہوس ہیں۔ عام مسلمان بھی حیوانی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ان کو فکری راہنمائی نہیں ملی جس کے ذمہ دار دیندار طبقات ہیں۔ ہمیں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ نہایت بے رحمی سے اپنی غلطیوں کا احتساب کریں۔ دوسروں کو فی الحال بھول جائیں اور صرف اور صرف اپنی ذات پر توجہ کریں اور دیکھیں کہ ہم میں کونسی خامیاں ہیں جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے۔ یا ہو رہا ہے۔ ہمارا اپنا کیا قصور ہے؟

بہت عرصہ سے میں سوچ رہا تھا کہ اس موضوع پر لکھوں۔ طالبان کے دورِ حکومت میں ان نادان دوستوں کی پالیسیوں پر میری یہاں کے اہلِ اسلام سے تلخ تر بحث جاری رہی۔ 9/11 سے چند ہفتے قبل ایک سینئر آفیسر کے ہاں کچھ اہل اسلام اکھٹے تھے۔ ساری رات بحث جاری رہی صبح ہونے لگی تو میں نے پیشن گوئی کی کہ اگر ملا عمر صاحب نے اپنی پالیسیاں نہ بدلیں تو

افغانستان اور اسلام پر بہت مشکل وقت آنے والا ہے، اور وہی ہوا جس میں میری روحانیت کو ذرا بھی دخل نہیں تھا بلکہ یہ نظامِ قدرت کا تقاضا تھا۔

اللہ عزوجل اس نظام کو ایک خاص ضابطے (سنتہ اللہ) سے چلا رہے ہیں۔ جہاں عام طور پر دو جمع دو چار ہی ہوتے ہیں۔ جناب ڈاکٹر برہان الدین فاروقی کا میں نے ایک بار بچپن میں اردو ڈائجسٹ میں انٹرویو پڑھا تھا جس نے میری کایا پلٹ دی۔ انٹرویو کا لب لباب یہ تھا کہ دنیاوی نظام اور روحانی نظام دونوں کے اپنے اپنے ضابطے ہیں۔ ہم جب ان ضابطوں کو توڑتے ہیں تو فطرت اپنا ردِ عمل ظاہر کرتی ہے۔ اللہ میاں ایک ضابطے کے تحت کام کرتے ہیں۔ اللہ میاں راجہ پورس کے ہاتھی نہیں (نعوذ باللہ) جو اپنے ہی لشکر کو روند ڈالے۔ لیکن ہم مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ غالباً یہ نظام تک بندی پر چل رہا ہے۔ کوئی قانونِ قدرت نہیں ہے۔ ہم جو چاہیں کریں اللہ پاک ہمارے ساتھ ہیں۔ اسلئے ہم خدا کے بنائے ہوئے ہر طبعی اور شرعی ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بھی خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ کافروں کی توپوں میں کیڑے پڑیں گے۔ یہ محال ہے بلکہ جنون ہے۔

اس موضوع پر لکھنے کی تحریک اُس وقت زیادہ ہوئی جب اس سال کے شروع میں محترم ارشاد احمد حقانی نے جنگ میں عہدِ حاضر میں دین کی تعبیر کے حوالے سے کچھ مضامین لکھے۔ اپریل میں دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد اور انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز نے علماء کیلئے ایک ورکشاپ کا اہتمام کیا جہاں مجھے بھی معروضات پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ علماء کے سامنے ان کا احتساب مشکل کام ہے لیکن میں اُن کا ممنون ہوں کہ انہوں نے 2 گھنٹے تک میری تلخ نوائی گوارا کی۔ آخر میں علماء کے ایک نمائندے نے بھری محفل میں ایک حقیقت پسندانہ بات کہی۔ ''ہم کسی کی بات نہیں سنتے۔ آپ کی سن لی کہ آپ ہمارے اپنے

ہیں۔دوسرے یہ کہ آپ نے ہمیں آئینہ دکھادیا ہے''۔اس تقریر کو میں نے جب مضمون کی شکل میں چھاپنا چاہا تو مشہور ادیب جناب مظہر الاسلام صاحب نے ارشاد فرمایا کہ یہ مفید باتیں ہیں ذرا تفصیل سے لکھ دیں۔میں نے ان کے حکم کی تعمیل میں اس اہم موضوع پر تفصیل سے لکھنے کا فیصلہ کرلیا۔

مجھے اس بات کا اندازہ ہے کہ اس کتاب کے مندرجات پر بہت سے اہل علم کو اختلاف ہوسکتا ہے۔میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اس پر علمی بحث کا آغاز ہو۔یہ بھی ممکن ہے کہ اس کتاب سے بہت سے شکوک وشبہات جنم لیں اس لئے میں اس تحریر کا فکری پس منظر واضح کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔میں پیدائشی طور پر مسلمان ہوں۔اور اسلام کی ابدی حقیقت پر ایمان رکھتا ہوں۔میں نے طویل عرصہ تک علماء وصوفیاء کرام سے کسب فیض کیا ہے۔اور میں اس بات پر کامل یقین رکھتا ہوں کہ علماء کے ایک طبقہ نے نا قابلِ بیان مشکل حالات میں مینارۂ نور کو روشن رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔جو کچھ بھی دین ہم تک پہنچا ہے یہ ان کی وساطت سے ہے۔اسلئے یہ ہمارے محسن ہیں مگر اہلِ اسلام کو اصلاح کی بھی بہت ضرورت ہے۔

میرا یہ بھی ایمان ہے کہ اسلام کی بنیادیں محکم ہیں۔ہمیں مغرب کے زیر اثر نیا دین متعارف کرانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے البتہ یہ انتہائی لازم ہے کہ ہم دین کی سنہری تعلیمات کی روشنی میں عہد حاضر میں دین کی از سرِ نو تشریح کریں۔فکر اسلامی کی تشکیلِ جدید کریں اور اس کیلئے ہمارے علماء بہتر کردار ادا کرسکتے ہیں۔ہمیں کسی آسمان سے اترنے والے کی ضرورت نہیں۔میں یہ بھی واضح کردینا چاہتا ہوں کہ میں تزکیہ نفس واحسان (تصوف) کا حامی ہوں لیکن اس کو متبادل دین نہیں مانتا۔آئمہ امت سے محبت کرتا ہوں،ان کا احترام کرتا ہوں لیکن دین کا منبع صرف اور صرف آقائے نامدار کو سمجھتا ہوں۔

بہت سارے مسائل جن پر یہاں بحث کی گئی ہے وہ مسلمانوں کے علاوہ افریقہ، ایشیاء، اور لاطینی امریکہ کی دیگر اقوام کیلئے بھی مشترک ہیں۔لیکن میں نے صرف مسلمانوں کے حوالے سے بات کی ہے۔اس کی تین وجوہات ہیں۔(1) اس کتاب میں میرا خطاب صرف مسلمانوں سے ہے۔(2) مسلمانوں کا شاندار ماضی تھا۔اب حالت بہت خستہ ہے اور (3) مسلمان بحیثیت قوم اس وقت ایک بہت کڑی آزمائش سے گزر رہے ہیں۔

اس کتاب میں خطاب اہلِ اسلام سے ہے۔خاص طور پر علماء، صوفیاء اور دین کی تعبیر کرنے والوں سے معروضات کی گئی ہیں۔خرابی کسی ایک طبقے میں نہیں بلکہ مسلم معاشرہ بحیثیتِ مجموعی اضمحلال اور بیماری کا شکار ہے۔علماء چونکہ سالارِ قافلہ ہیں اسی لئے عام طور پر گفتگو کا رخ ان کی جانب ہو جاتا ہے۔

یہ معروضات مسلمانوں کی بے بسی کا نوحہ ہیں اسلئے ان میں کہیں کہیں شدتِ غم سے تلخی پیدا ہو گئی ہے جس کیلئے میں معذرت خواہ ہوں۔درخواست ہے کہ انہیں محبت کی ایک ادا سمجھا جائے چونکہ جب سامعین میں نغمہ سننے کا ذوق وشوق نہ ہو تو پھر لے کو تیز اور تیکھا کرنا پڑتا ہے۔

اس کتاب میں دین کی موجودہ تعبیر پر تنقید کی گئی ہے اور فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید کی بات کی گئی ہے۔اس نزاکت کے پیش نظر میں نے اس کتاب کا مسودہ جناب تقی عثمانی (سابق جج شریعت اپیلٹ بنچ سپریم کورٹ)، جناب محمود احمد غازی (سابق وفاقی وزیر مذہبی امور)، جناب قاری حنیف جالندھری (وفاق المدارس)، جناب جاوید احمد غامدی (المورد)، جناب ارشاد احمد حقانی (روزنامہ جنگ)، ڈاکٹر انیس احمد (رفاہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی)، جناب میاں اللہ نواز (سابق چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ)، ڈاکٹر خالد محمود شیخ (اقراء انٹرنیشنل امریکہ) کو بھیجا۔جناب تقی عثمانی اور جناب قاری حنیف جالندھری صاحب نے اپنی مصروفیات

کے سبب رائے دینے سے معذرت کر لی۔ ڈاکٹر انیس احمد صاحب کے علمی مشوروں کی روشنی میں نفسِ مضمون میں کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں جب کہ دیگر اصحاب کی آراء کتاب میں شامل کر دی گئی ہیں۔

کتاب کی تیاری اور طباعت میں مدد کرنے پر میں جناب وقار اسلم حمدی، بشیر احمد ندیم، مظہر الاسلام، علی اصغر چشتی، شعیب بن عزیز، وقار احمد اور سیّد محمود حسین کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔

میں اہلِ علم سے مخلصانہ گزارش کرتا ہوں کہ میری ان معروضات پر کھلے دل سے غور کریں، کتاب کے نفسِ مضمون پر بحث کو آگے بڑھائیں تا کہ فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کی طرف بڑھا جا سکے، جو عہدِ حاضر کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

بیرسٹر ظفر اللہ خان

اسلام آباد

نومبر ۲۰۰۴

## پہلا باب

# زندگی کے بنیادی اصول

### (i) حرکت

1971ء کی بات ہے میں نے چھٹی جماعت میں جب داخلہ لیا تو ایک استاد محترم اکثر اقبال کی یہ نظم بلند آواز میں گھن گرج کے ساتھ پڑھ کر سناتے تھے:۔

### چانداور تارے

ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے　　تارے کہنے لگے قمر سے
نظّارے رہے وہی فلک پر　　ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا　　چلنا ، چلنا ! مدام چلنا
بےتاب ہے اس جہاں کی ہر شے　　کہتے ہیں جسے سکوں، نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کشِ سفر سب　　تارے، انسان، شجر، حجر، سب
ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا
منزل کبھی آئے گی نظر کیا

کہنے لگا چاند، ہم نشینو　　اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو!
جُنبش سے ہے زندگی جہاں کی　　یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ　　کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے　　پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں　　جو ٹھہرے ذرا، کُچل گئے ہیں
انجام ہے اس خرام کا حُسن　　آغاز ہے عشق، انتہا حُسن

مفہوم تو اس پیاری نظم کا میری ننھی سی عقل میں نہ آیا لیکن بول یاد ہو گئے۔ اس طرح کہ آج بھی استاد محترم کی وہ گرجدار آواز میرے ذہن میں گونجتی ہے۔ چلنا چلنا مدام چلنا۔۔۔ جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں۔

1974 میں میں نے مدرسہ میں داخلہ لے لیا۔ منطق (Logic) کی تعلیم شروع ہوئی تو سب سے پہلے جو کتاب ہم نے پڑھی اس کا نام ''ایساغوجی'' تھا۔ اس کی پہلی سطر کچھ اس طرح تھی ''عالم متغیر ہے''۔ مجھے کتاب کا نام تو مزاحیہ لگا لیکن اس کی پہلی ہی سطر نے مجھ پر سنجیدگی طاری کر دی کہ دنیا ہر لمحے متغیر ہے۔ 1971 اور 1974 اور آج کا دن، میں اس تصور کو سمجھنے کی سعی کر رہا ہوں۔ ایک بات جب کچھ سمجھ میں آتی ہے تو اتنے میں اس میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ ان بیس سالوں میں شعوری اور عملی طور پر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کائنات کی اصل تبدیلی ہے، قرآن بھی یہی کہتا ہے۔

ہر آن وہ نئی شان میں ہے (سورۃ رحمٰن۔ آیت 29)

دنیا کبھی ایک حال پر نہیں رہتی۔ ہر لمحہ اس کے حالات بدلتے رہتے ہیں اور اس کا خالق ہر بار اُسے ایک نئی صورت میں ترتیب دیتا ہے۔ جو پچھلی تمام صورتوں سے مختلف ہوتی ہے۔

رات اور دن کا الٹ پھیر وہی کر رہا ہے۔ اس میں ایک سبق ہے
آنکھوں والوں کیلئے (سورۃ النور 44)۔

ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کائنات میں جمود (Inertia) نہیں ہے بلکہ حرکت ہے۔ مستقل حرکت ہے۔ مستقل بہاؤ ہے جس میں کوئی ٹھہراؤ نہیں ہے۔ وقت آگے بڑھ رہا ہے ہر لمحہ نیا ہے۔ ہر لمحہ ایک نئی دنیا ہے۔ حرکت ہی حرکت ہے جس میں کوئی

رکاوٹ ہے نہ کوئی تقسیم۔ اب تو سائنس نے بھی کہہ دیا ہے کہ مادہ بھی مستقل نہیں ہے بلکہ تغیر پذیر ہے۔ تبدیلی کے خالق نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس تبدیلی کو صرف عقل والے سمجھ سکتے ہیں، بے عقل لوگ جامد رہتے ہیں حال پر خوش رہتے ہیں۔ تبدیلی کا ساتھ نہیں دیتے۔

ہر تبدیلی ایک لمحہ پہلے ٹھہراؤ ہوتا ہے۔ ثبات ہوتا ہے۔ ماضی ہوتا ہے۔ تبدیلی کیلئے استقلال لازم ہے۔ حال کیلئے ماضی لازم ہے اس لئے تغیر کے ساتھ ساتھ ثبات بھی حقیقت ہے۔ صرف ثبات پر رہنا جمود ہے۔ صرف تبدیلی پر رہنا بے یقینی ہے۔ اگر انسان ثبات پر رہے گا اور تغیر کو نظر انداز کرے گا تو قصہ ِ پارینہ بن جائے گا۔ اگر صرف تغیر کا ساتھ دے گا تو ماضی سے کٹ کر کٹی ہوئی پتنگ بن جائے گا اس لئے معلوم ہوا کہ ثبات وتغیر دونوں کائنات کی اصل حقیقت ہیں۔ ہر وقت ان کا باہمی عمل حیاتِ انسانی میں حسن وتوازن برقرار رکھتا ہے۔

انسانی اور اخلاقی سطح پر اس تبدیلی کا ایک خاص مطلب ہے۔ مقصد ہے، یہ چھانٹ (Filter) کا ایک عمل ہے جس سے فطرت کارآمد اور بے کار کو الگ کرتی ہے۔ انسانوں کی آزمائش کرتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے۔

> ہم دنوں کو لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں۔ تاکہ ہم چھانٹ سکیں کہ اللہ کی قدرت ونظام کو کون سمجھتا ہے اور کون اس کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے۔ جو ایسا نہیں کرے گا وہ ظالم ہوگا
>
> (آلِ عمران۔140)

اس آیتِ کریمہ نے یہ بات واضح کردی ہے کہ صرف وہی لوگ زندہ رہیں گے جو تبدیلی کا ساتھ دیں گے۔ جو تبدیلی کا ساتھ نہیں دیں گے وہ اپنے آپ پر ظلم کریں گے اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

### (ii) جہد و جہد

ہر لمحہ کی اس تبدیلی کیلئے ہر لمحہ جہد کرنا پڑتی ہے۔ ہماری مسلم تاریخ کے عظیم فلسفی اور سائنسدان ابن مسکویہ نے صحیح فرمایا ہے کہ کائنات میں انفرادی اور اجتماع سطح پر جہدللبقاء (Struggle for Existence) جاری ہے۔اس جدوجہد میں صرف وہ چیز زندہ رہتی ہے جو بہترین ہے۔یہی وہی اصول ہے جسے عہدِ حاضر میں چارس ڈارون نے (Survival of the Fittest) کا نام دیا ہے۔ہم ان اصولوں کی حیاتیاتی تعبیر تو نہیں مانتے لیکن انسانی اوراخلاقی سطح پر ان اصولوں کا ادراک ہم ہرروز خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔جو قومیں مادی ترقی نہیں کرتیں وہ صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہیں۔جو معاشرے اعلیٰ اخلاق سے محروم ہوجاتے ہیں وہ ناپید ہوجاتے ہیں۔

قرآن کی بیان کردہ انسانی اور نبوی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ صرف اور صرف اعلیٰ اخلاقی اقدار میں ہی انسانیت کی بقا ہے۔قرآن نے اصول بیان کئے ہیں۔

> اللہ حق و باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے۔جو جھاگ ہے وہ
> اڑ جاتا ہے اور جو چیز انسانوں کیلئے نفع دینے والی ہے وہ زمین میں
> قائم رہتی ہے(الرعد۔17)

کیا خوبصورت اصول بیان کیا گیا ہے۔جھاگ جیسی غیرضروری چیزیں ختم ہوجاتی ہیں۔غیرمفید چیزیں ختم ہوجاتی ہیں،انسانیت کیلئے مفید چیزیں زندہ رہتی ہیں اگر ایک فرد جھاگ بن کررہ جائے گا تو وہ مٹ جائے گا۔اگر کوئی قبیلہ،قوم یا مذہب بے کار ہوجائیں تو وہ مٹ جائیں گے۔اس طرح اگر کوئی فرد اپنے اندر انسانیت کیلئے نفع پیدا کرلے گا تو وہ دنیا میں امر ہوجائے گا اگر کوئی قوم یا مذہب انسانیت کیلئے مفید بن جائے گا تو لازوال ہوجائے گا۔

ہرگز نمیرد آن کہ دلش زندہ شد باعشق

ثبت است برجریدہِ عالم دوامِ ما

(جس کا دل عشق سے زندہ ہو جائے وہ کبھی بھی نہیں مرتا۔ہم چونکہ انسانیت کے عشق میں مبتلا ہیں اس لئے دنیا کے نقشہ پر ہم ہمیشہ زندہ رہیں گے)

انسانوں میں صلاحیتِ حیات،توانائی اور عظمت ان اعمال سے پیدا ہوتی ہے جن کی تفصیل اللہ نے دی ہے۔یعنی علم،عبادت،صداقت،دیانت،محبت،خدمت، عدل اور گناہ سے نفرت۔سچائی قوت ہے۔اور جھوٹ کمزوری ہے۔عدل قوت ہے اور ظلم کمزوری۔دنیا میں وہی اقوام قائم رہتی ہیں جو اچھے اعمال سے اپنے اندر زندگی کی قوت وصلاحیت پیدا کرلیں سورۃ انبیاء میں ارشاد ہے۔

ہم نے زبور میں (اچھائی اور برائی کے) ذکر کے بعد یہ بات لکھ دی تھی کہ زمین کے وارث وہی لوگ ہوں گے جو اچھے اعمال (قوت والے اعمال) کریں گے(105)

ان اصولوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا میں وہی قومیں اور مذاہب قائم رہتے ہیں جو انسانیت کیلئے مفید ہوتے ہیں۔جن میں صلاحیت حیات ہوتی ہے،علم ہوتا ہے،صداقت ہوتی ہے،خدمت ہوتی ہے،عدل ہوتا ہے،اور وہ قومیں اور مذاہب مٹ جاتے ہیں جو انسانیت کیلئے مفید نہیں رہتے جن میں جہالت آ جاتی ہے۔جھوٹ آ جاتا ہے۔مردم بیزاری آ جاتی ہے۔انسانیت کا کارواں شاہراہِ وقت پر ازل سے رواں دواں ہے۔اگر کسی قوم کی رفتار کم تر ہو جاتی ہے تو تیز رفتار والی قومیں اس کو پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔اگر کسی کمزور قوم کو کوئی حادثہ پیش آ جائے تو پیچھے سے آنے والے ذرا سی دیر کیلئے رکتے ہیں بعض اوقات افسوس کا اظہار بھی کرتے

ہیں مگر پھر اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو جاتے ہیں یہی رویہ ہمارا دنیاوی سڑک پر ہوتا ہے۔ گاڑی کو جب کوئی حادثہ پیش آ جاتا ہے تو دوسری گاڑیوں والے ذرا دیر کیلئے رکتے ہیں مگر پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

یہ بات تو طے ہوگئی کہ ثبات وتغیر زندگی کیلئے لازم ہیں۔تغیر وہی اچھا ہے جس میں انسانیت کیلئے نفع ہو اور وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جن میں علم وخدمت کی طاقت ہو۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کو کیسے یقینی بنایا جائے کہ ہم تغیر کا ساتھ دے رہے ہیں۔ہم اچھائی کی طرف گامزن ہیں اور ہم انسانیت کیلئے مفید ہیں۔اس کیلئے احتساب کا عمل ہوتا ہے۔احتساب دوطرح سے ہوتا ہے۔اپنا احتساب خود آپ کرلیا جائے یا پھر کوئی اور کرے۔اسلام خود احتسابی سکھاتا ہے۔محاسبہ نفس سکھاتا ہے۔اللہ پاک نے انسان کے اپنے آپ کو ملامت کرنے کے عمل کو محبوب رکھا ہے اور اس کی قسم اٹھائی ہے (الصّٰفّٰت ۔2) صوفیا کرام کی تعلیمات میں یہ بات بہت اہم ہے کہ ہم ہر روز سونے سے پہلے مراقبہ کریں۔احتساب کریں کہ آج میں نے کیا اچھا کیا ہے اور کیا برا کیا ہے۔صوفیاء کے ہاں دو اصول ہیں۔نگہ برقدم (ہر قدم پر نظر) اور نگہداشت (خیال رکھنا) یعنی کہ ہر لمحے اور ہر قدم پر ہمیں سوچنا چاہیے۔اپنا احتساب کرنا چاہیے کہ کیا ہم ٹھیک کر رہے ہیں۔یہ تعلیمات ہمیں ہر لمحے اپنے نفس کا احتساب سکھاتی ہیں جو شخصی اور قومی بقا کیلئے لازم ہے۔

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

احتساب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہمیں معلوم ہوتا رہے کہ کیا ہم زمان ومکان کی تبدیلیوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔کیا نئے زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں۔کیا ہم نئے چیلنج کا جواب صحیح طور پر دے رہے ہیں۔

اسلام نے ثبات اور تغیر کے اصولوں کو اپنایا ہے۔ثبات کیلئے اس نے ہمیں ایسی تعلیمات دی ہیں جو محکم ہیں۔ابدی ہیں جن میں وقت اور جگہ کے ساتھ کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ مثال کے طور پر خدائے واحد کی ذات پر یقین، انبیاء پر یقین، نبی اکرم کے آخری نبی ہونے پر یقین، آخرت پر یقین، قرآنِ پاک پر یقین، جزاوسزا پر یقین، زندگی بسر کرنے کیلئے بنیادی حرام وحلال پر یقین۔ یہ وہ اصول ہیں جو محکم ہیں۔ان میں کوئی تبدیلی نہیں۔ یہ ثبات کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔انسانی نفسیات اور اجتماعی زندگی کو ایک محکم بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

تغیر وتبدیلی کا ساتھ دینے کیلئے اسلام نے ہمیں اجتہاد کا تصور دیا ہے۔معروف کو ماننے کا تصور دیا ہے۔ان بنیادی اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے زندگی کی محترک تعبیر کرنے کو کہا ہے۔زمانے کے ہر نئے چیلنج سے عہدہ براہونے کو کہا ہے۔قرآن وحدیث کی عہدی تعبیر کا حکم دیا ہے۔اگر قرآن وحدیث سے راہنمائی نہ ملے تو عقل وقیاس سے کام لینے کا حکم دیا ہے۔ حضرت معاذ ابن جبل کو جب آنجنابؐ نے یمن میں حاکم بنا کر بھیجا تو پوچھا کہ معاملات کیسے طے کروگے۔حضرت معاذ نے فرمایا کہ قرآن وحدیث سے راہنمائی لوں گا۔آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہاں واضح ہدایات نہ ملیں تو کیا کروگے۔حضرت معاذ نے ارشاد فرمایا میں اپنی عقل سے کام لوں گا۔آنجنابؐ نے اس جواب پر مسرت کا اظہار فرمایا۔

اس ضمن میں ایک دوسری حدیث بھی قابل غور ہے۔آنجناب جب مدینہ تشریف لے گئے تو آپ نے کھجوروں کے درختوں کی باہمی عملِ گلِ زیرہ پوشی (pollination) کو ناپسند فرمایا۔لوگوں نے اس عمل کو چھوڑ دیا جس سے کھجوروں کی فصل کم ہوگئی۔لوگوں نے شکایت کی آپؐ نے ارشاد فرمایا۔

> آپ دنیا کے معاملات مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔وہی کرو جو بہتر ہے۔اگر اس عمل سے فائدہ پہنچتا ہے تو ان کو چاہیے کہ وہ کرتے

رہیں۔ میں نے تو اپنے ایک گمان (ظن) کا اظہار کیا تھا جب اللہ
کی طرف سے کوئی چیز بتاؤں تو اس پر عمل کرو (مسلم)

اس سے اصول ثابت ہوا کہ زمانے کا معروف علم سیکھنا اور اسی پر عمل کرنا لازم ہے۔ اجتہاد اور معروف کو ماننے کے اصول تغیر کا ساتھ دینے کیلئے ہیں۔ انہیں اصولوں پر عمل کرتے ہوئے مسلمانوں نے عہد اول میں ہر مسئلے کا حل ڈھونڈا بلکہ نئے علوم پیدا کئے اور دنیا کے امام بن گئے۔ ہم نے اجتہاد کا دروازہ بند کرلیا اور معروف کو ماننا چھوڑ دیا۔ ہم ماضی کا قصہ بن گئے۔ انہوں نے ہر چیلنج کا مناسب جواب (Response) دیا اور اپنے علم وعمل کو آگے بڑھایا۔ ہم ماضی کی پرستش کررہے ہیں ہم کہتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا نے بہت کام کیا ہے۔ پدرم سلطان بود (میرے والد بادشاہ تھے) ہم خود ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہیں۔

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات، کشمکشِ انقلاب

ان بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں ہم نے ماضی میں ہر چیلنج کا جواب (Response) دیا ہے۔ جس کی وجہ سے زمانے میں ہمارا سکہ چلتا رہا۔ یہاں میں صرف دو چیلنجوں کا ذکر کروں گا۔ سیاسی چیلنج اور علمی چیلنج اور پھر کچھ مثالیں پیش کروں گا ابتدائی عہد کے مسلمانوں نے ان خطرات کا کیسے جواب دیا اور ان کو اپنے لئے کیسے مفید بنایا تا کہ ہم دیکھ سکیں کہ آج ہماری کیا حالت ہے۔ کیا ہم خود احتسابی کررہے ہیں؟ اور کیا ہم حالات کے تغیر کا جواب دے رہے ہیں؟

## دوسرا باب

# عہد اوّل کے چیلنج

## (الف) سیاسی چیلنج

آیئے ہم عہدِ اوّل کے سیاسی چیلنج اوراس کے اسلامی جواب کا مختصراً جائزہ لیں۔

### (i) ملوکیت

اسلام کی بعثت کے وقت ہمسایہ مما لک میں سیاسی نظام ملوکیت کے اصولوں پر قائم تھا خاندانی بادشاہتیں تھیں جہاں عوام کی حیثیت جانوروں جیسی تھی جنہیں امورِ مملکت میں کوئی دخل نہ تھا۔ اسلام نے اعلان کیا کہ:

☆ مسلمانوں کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔
(سورۃ الشوریٰ، آیت 38)۔

☆ مسلمانوں کی اکثریت (سوادِاعظم) کی بات مانی جائے گی
(ابن ماجہ بروایت حضرت عبداللہ ابن عمر)

☆ آپ پر فرض ہے کہ جماعت اوراُمت کی اکثریت کی بات مانیں (مسند احمد بن حنبل)۔

☆ عمومی معاملات طے کرنے سے پہلے مشہورہ کریں
جب کوئی لائحہ عمل (عزم) طے کرلیں تو اللہ پر بھروسہ کریں
(سورۃ آلِ عمران، آیت 159)

حضرت علیؓ نے روایت کیا ہے کہ نبی اکرمؐ سے پوچھا گیا کہ عزم سے کیا مراد ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ عزم سے مراد

اہل رائے ( اہل عقل ) سے مشورہ کرنا اور ان کی بات
مانناہے۔ (تفسیرابن کثیر )

اس سیاسی شورائی فکر نے دنیا میں عوامی انقلاب برپا کر دیا۔ قیصر وکسریٰ کی سلطنتیں اس انقلابی ریلے میں بہہ گئیں۔ خاندانی بادشاہوں کی جگہ پر غلام ابن غلام حکمران بن گئے۔ زمانے نے بھری بزم میں خلیفہ کا احتساب دیکھا۔ پھر کیا ہوا۔ ہمارے ہاں بھی رومی وایرانی روایات آ گئیں ہم نے بھی خاندانی بادشاہتیں قائم کرلیں۔ وہ مسلمانوں کی ملوکیت تو تھی مگر اسلامی شورایت نہ تھی۔ اسلام کی انقلابی سیاسی جمہوری روح دفن کردی گئی۔ بادشاہوں نے نعرہ لگایا کہ وہ خدا کا سایہ (ظل اللہ) ہیں۔ علماء نے اس غیر اسلامی نظریے کی تائید کی۔ پوری سیاسی تاریخ میں اکثر علماء کی کتب میں یہ بحث درج ہے کہ امیر کی اطاعت لازم ہے۔ شوریٰ صرف مشورہ دے سکتی ہے۔

اس کا کیا انجام ہوا۔ اس کی دومثالیں دیکھیں۔ دین الٰہی کے بنانے والوں نے اپنے عہد کے سب سے جید علماء ملاّ مبارک، ملاّ ابوالفضل اور فیضی شامل تھے۔ اس عہد کے 450 علماء نے ایک محضر نامہ لکھا کہ شہنشاہ اکبر کو دین کی تعبیر کا حق حاصل ہے اور اس کی اطاعت واجب ہے۔ اس کا انجام دینِ الہٰی کی شکل میں سامنے آیا۔ جب مجدد الف ثانی اور پھر اورنگ زیب نے دینِ الہیٰ کی مخالفت کی تو اکثر صوفیا اور علماء نے مجددی تحریک کے خلاف مغل بادشاہوں کا ساتھ دیا۔ اورنگ زیب کی بجائے داراشکوہ کا ساتھ دیا۔

یہ تو تھیں علمی باتیں۔ عملی طور پر ملوکیت نے سیاسی جبر پیدا کیا ہندوستان کے ایک مسلمان حاکم نے کسی شہری سے ناراض ہوکر اسے ہاتھی کے پاؤں تلے روندنے کا حکم دیا۔ شام کو جب بادشاہ سلامت مغرب کی نماز پڑھنے لگے تو امام صاحب نے اتفاقاً سورۃ الفیل (جس میں ہاتھی والوں کی بربادی کا ذکر ہے) کی تلاوت کی۔ بادشاہ سلامت برہم ہوگئے کہ امام اس کی

تضحیک کر رہا ہے۔ بادشاہ سلامت نے حکم دیا کہ اس امام کو بھی ہاتھی کے پاؤں تلے روند دیا جائے۔ حضرت اقبال فرماتے ہیں۔

ملوکیت کرتی ہے آثارِ جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو کہ چنگیز

(ii) غلامی

سیاسی نظریئے میں اسلام نے اس عہد کی انسانی غلامی کی تمام شکلوں کی مخالفت کی اور انسان کو آزادی کا درس دیا۔ سیّدنا عمرؓ کا وہ تاریخی فقرہ یاد کریں کہ

'ماؤں نے انسانوں کو آزاد جنا ہے۔ تم ان کو کیوں غلام بناتے ہو'

یہ آزادی کا اعلان عہد حاضر کے مشہور فلسفی اور سیاسی مفکر روسو (1778ء) کے اس مشہور نعرہ سے بھی زیادہ جامع ہے کہ

انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر ہر جگہ غلامی کی زنجیروں میں ہے

روسو تو ہزار سال بعد ایک حقیقت کا اظہار کر رہا ہے مگر حضرت عمرؓ انسانی آزادی کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ یہ صرف جسمانی غلامی کے خلاف جہاد نہیں تھا بلکہ غلامی کی تمام شکلوں کے خلاف بغاوت تھی جس کا اظہار ایران کے شہنشاہ کے دربار میں حضرت سعد بن وقاص کے قاصد نے بہت خوبصورت پیرائے میں کیا۔

ہم انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں ڈالنا چاہتے ہیں

اس لئے کہ اللہ کی غلامی انسان کو باقی تمام غلامیوں سے نجات دے دیتی ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

غلامی کا عمل ہمہ گیر اثرات کا حامل ہے اور شرفِ انسانی کے خلاف ہے، انسانی دائرہ عمل سکڑ کر رہ جاتا ہے۔ آزادی میں انسان اپنی ذات کا بھر پور اظہار کر سکتا ہے، تخلیقی عمل کو بروئے کار لا سکتا ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے یہ جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

ہمارے بادشاہوں کو یہ انسانی شرف پسند نہ آیا۔ انہوں نے انسانوں کو جسمانی اور ذہنی طور پر غلام بنانا شروع کر دیا۔ غلاموں کی خرید وفروخت ہونے لگی۔ حرم میں باندیوں کا ہجوم بڑھنے لگا۔ علماء نے قرآن وحدیث کی تعلیمات کے خلاف فقہ کی کتابوں میں غلاموں اور باندیوں کے مسائل اور جواز کے دلائل دیئے۔ اسلام کی حریت کی تعلیم اور شرفِ انسانی کی تعظیم کو پسِ پشت ڈال دیا گیا۔ جس نے بھی ذرہ بھر آواز بلند کی اس کو قید وسلاسل میں ڈال دیا گیا۔ شہید کر دیا گیا۔ حضرت امام حسینؓ، زید نفس ذکیہ، احمد بن حنبل، امام ابوحنیفہ، مجدد الف ثانی، امام سرخسی کی مثالیں سامنے ہیں۔

### (iii) ظلم

اسلام نے ظلم کے معاشرے کے خلاف عدل کا اعلان کیا۔ افلاطون نے ایک نظری بحث کے طور پر کہا کہ

انصاف نیکی ہے اور نیکی انصاف ہے

قرآن نے اس سے بڑھ کر بات کی کہ

دنیا میں تمام انبیاء اور تمام آسمانی کتابیں اس لئے نازل کی گئی ہیں
تا کہ لوگوں کے درمیان انصاف قائم کیا جا سکے (سورۃ الحدید 25)

انبیاء اور تورات، زبور، انجیل اور قرآن کی بعثت کا مقصد نماز روزہ، حج اور زکوٰۃ قائم کرنا نہیں ہے بلکہ انصاف قائم کرنا ہے۔ اس سے بہتر عدل کی تبلیغ کیسے ممکن ہے؟

بعض علماء نے تو یہاں تک کہا ہے کہ کافروں کی عادلانہ حکومت مسلمانوں کی ظالمانہ حکومت سے بہتر ہے۔ حضرت علیؑ کا مشہور قول ہے۔

'الملکُ یبقیٰ مع الکفر و لا یبقیٰ مع الظلم'

(حکومت کفر کے ساتھ چل سکتی ہے ظلم کے ساتھ نہیں چل سکتی)

مسلمانوں نے عدل کی بہت جامع تعریف کی۔ ظلم کو بہت جہتوں سے دیکھا۔ کسی بھی چیز کو اس کی اصل جگہ پر رکھنے کو عدل کہا اور کسی بھی چیز کو غلط جگہ پر رکھنے کو ظلم قرار دیا۔ عدل و ظلم کی اسی تعریف نے انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے احاطہ میں لے لیا۔ مسلم معاشرہ عدل کی بنیادوں پر قائم ہوا جہاں سماجی عدل بھی تھا۔ سیاسی عدل بھی تھا اور معاشی عدل بھی تھا۔ استحصال کی تمام شکلیں حرام قرار پائیں۔ حقوق و فرائض میں، فرد و معاشرے میں، ریاست اور شہریوں میں عدل قائم ہو گیا۔

پھر آہستہ آہستہ شیطانی و نفسانی فکر غالب آنا شروع ہو گئی۔ سیاسی و سماجی استحصال شروع ہوا۔ معاشی ظلم شروع ہوا۔ یہاں تک کہ بادشاہوں نے اپنے ظلم کے جواز کیلئے علماء کی خدمات حاصل کیں۔ روشنی کے چند میناروں کے سوا اکثر علماء نے پوری تاریخ میں ظلم پر نہ صرف عملاً خاموشی اختیار کی بلکہ اس کی مختلف شکلوں کے مختلف جواب اور جواز ڈھونڈے۔ اس کی ایک مثال فقہ کی کتابوں میں زکوٰۃ سے بچنے کے طریقے ہیں۔ آپ کو فقہ کی کتب میں ''حیلہ کا باب'' ملتا ہے جہاں بنی اسرائیل کے حیلے بھی حقیر معلوم ہوتے ہیں اور پھر یہ ہوا کہ عدل کو ہم بھول گئے اور ظلم کو اس کی تمام شکلوں میں ہم نے قبول کر لیا۔

## (iv) تذلیلِ انسانی

اسلام نے شہریوں کے حقوق کی بات کی۔ اعلان کیا کہ انسانی حقوق اس لئے ہیں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ یہ سیاسی وسماجی ومعاشی حقوق اس لئے نہیں کہ بادشاہ نے عنایت کئے ہیں۔ آقائے نامدار نے تاریخ انسانی میں پہلی بار نہایت ہی وضاحت کے ساتھ حج الوداع میں انسانی حقوق کا چارٹر دیا جس کے بارے میں پورے علمی یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ عہد حاضر کی انسانی حقوق کی تحریک کی ابتداء وہاں سے ہوئی۔ یہ تحریک اسی خطبے سے روشنی لے رہی ہے یا ابھی اس کی تلاش میں ہے۔ اسلام نے حقوق کی حفاظت ریاست کے سپرد کی اور تصور حقوق کو بہت وسعت عطا کی۔

آنجناب ﷺ کو دیکھیں۔ آپ ﷺ کو شہریوں کے تعلیمی حق کا کتنا خیال تھا کہ عام طور پر جنگی قیدیوں سے فرماتے تھے کہ ہمارے لوگوں کو تعلیم دے دو۔ تم آزاد ہو جاؤ گے۔ آپ ﷺ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ یہودی اور عیسائی قیدی مسلمانوں کا ایمان خراب کر دیں گے۔

معاشی حقوق کا جائزہ لیں۔ جب سیّدنا عثمانؓ نے حضرت ابوذرؓ کو بلایا کہ آپ معاشی انصاف پر اتنا زور کیوں دیتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میرے پاس ایک بکری ہے۔ اس کا آدھا دودھ میرا ہے اور آدھا ہمسایوں کا اور یہی قل العفوٗ ہے حضرت عثمانؓ نے کہا کہ اس کی دلیل کیا ہے تو سیّدنا ابوذرؓ نے کیسا خوبصورت جواب دیا۔

'اوصانی خلیلی (میرے دوست رسول اللہ کا یہی حکم ہے)'

سیّدنا عمرؓ کا یہ کہنا کہ اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مرا تو اس کا حساب مجھ سے لیا جائے گا یہ ایک نعرہ نہیں تھا۔ ان کے الیکشن کا منشور نہیں تھا بلکہ اسلامی فکر اور سیاسی پالیسی کا اعلان تھا۔

دل چاہتا ہے کہ آنجناب ؐکی ایک نہایت ہی مختصر اور نہایت ہی خوبصورت حدیث آپ کو سناؤں۔آپ نے فرمایا۔

'اناولیّ من لّاولی له'

میں اس کا ذمہ دار ہوں جس کا کوئی مددگار نہیں

یہ محض ایک اخلاقی نصیحت نہیں بلکہ ہر مسلمان کو اس کی ذمہ داری بتائی جا رہی ہے کہ مسلمان معاشرے کے تمام کمزور طبقات (غریب، بیوہ، یتیم، خواتین وغیرہ) کے ذمہ دار ہیں۔ یہ وہ تعلیمات تھیں جنہوں نے ایک خوبصورت معاشرہ قائم کیا جہاں انسان کی عزت تھی۔ وہ ادنیٰ نہ تھا بلکہ اللہ کا خلیفہ تھا۔ کائنات کا دلہا تھا۔ مسجودِ ملائکہ تھا۔ مقصودِ قرآن تھا۔

## (ب) علمی چیلنج

آیئے ہم دیکھیں کہ مسلمانوں نے اپنے ابتدائی زمانے میں اس عہد کے علمی چیلنجوں کا کیسے مقابلہ کیا؟

اسلام کے مطابق انسانیت کی ابتداء علم سے ہوئی ہے۔

جب اللہ پاک نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں۔۔انہوں نے عرض کیا کہ کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خون ریزیاں کرے گا۔آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔فرمایا میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔اور فرمایا۔اگر تمہارا خیال صحیح ہے تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ انہوں نے عرض کیا۔نقص سے پاک تو صرف آپ کی ذات ہے۔ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے۔حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں پھر اللہ نے آدم سے کہا۔تم انہیں ان چیزوں کے نام بتاؤ۔جب اس نے ان کو ان سب کے نام بتادیئے تو اللہ نے فرمایا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں۔(سورۃ البقرہ۔آیت 33)

آپ ملاحظہ فرمائیں۔فرشتوں کی تقدیس وعبادت کے مقابلے میں انسانی علم کو لایا جارہا ہے۔علم دے کر آدم علیہ السلام کو فرشتوں سے فضیلت دی گئی۔علم کو عبادت سے افضل قرار دیا جارہا ہے۔شرفِ آدم قرار دیا جارہا ہے۔علم ہی اللہ کا نائب بننے کیلئے لازم ہے۔علم بھی اشیاء کا دیا جارہا ہے۔جو سائنس کا موضوع ہیں۔

اسلام کی ابتداء علم سے ہوئی۔رسالت مآب پر پہلی وحی یہ نازل ہوئی۔

(اقراء بااسم ربك الذی خلق،خلق الانسان من علق)

پڑھو(اے نبی)اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی پڑھو،اور تمہارا رب بڑا کریم ہے۔جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔(سورۃ العلق)

آپ دیکھ لیں کہ نبوت واسلام کی ابتداء سائنسی علوم کی طرف مائل کرنے سے ہورہی ہے خدا کی معرفت کیلئے علم حیاتیات (Biology) کی دلیل لائی جارہی ہے۔پھر قلم کی عظمت بیان ہورہی ہے۔کائنات کی عام تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد خاص طور پر انسان کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کس کمزور حالت سے اس کی تخلیق کی ابتداء کر کے اسے پورا انسان بنایا۔یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے انسان کو صاحبِ علم بنایا جو مخلوقات کی بلند ترین صفت ہے اور صرف صاحبِ علم ہی نہیں بنایا بلکہ اس کو قلم سے لکھنے کا فن سکھایا جو بڑے پیمانے پر علم کی اشاعت وترقی کا ذریعہ بنا۔اگر وہ الہامی طور پر انسان کو لکھنے کا فن نہ دیتا تو انسان کی ترقی رک جاتی اور علم اگلی نسلوں تک منتقل نہ ہوتا۔

فلسفہ مسلمانوں کا علم نہیں ہے۔ اسلام کی بعثت سے پہلے معلوم انسانی تاریخ کے عظیم ترین فلسفی یونان میں پیدا ہو چکے تھے۔ دنیا میں افلاطونی مثالیت (Platonic Idealism) ارسطو کی منطق (Aristotlean Logic) وغیرہ کا غلبہ تھا مسلمانوں نے فلسفہ کو کفر قرار نہ دیا بلکہ اس کی تعلیم حاصل کی۔ فارابی پہلا مسلمان عالم تھا جو یونان کے فلسفہ کا شارع بنا اور تاریخ فلسفہ میں ارسطو کو معلم اوّل اور فارابی کو معلم ثانی کہا جاتا ہے۔

ہمارے علماء نے فلسفہ یونان کو سمجھا۔ اس کا عربی میں ترجمہ کیا گیا تاکہ مسلم دنیا میں پڑھا جا سکے۔ اور پھر اس پر عالمانہ تنقید کی۔ امام غزالی نے تہافتہ الفلاسفہ (فلسفیوں کی تباہی) لکھی۔ اس میں انہوں نے یونان کے فلسفہ پر سخت تنقید کی جس کا جواب یونان کی بجائے مسلم دنیا کے نامور فلسفی ابن رشد نے دیا۔ ان کی کتاب کا نام تہافتہ التہافہ (تباہی کی تباہی) ہے۔ اس کے بعد امام ابن تیمیہ نے فلسفہِ یونانی پر کاری ضرب لگائی۔ اس شرح اور تنقید کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں نے فلسفہ یونان کو پڑھا۔ اسے آگے منتقل کیا لیکن اس سے مرعوب نہ ہوئے۔

یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے یونان کے اس بے بہا علم کو مغرب تک پہنچایا۔ جرمن فلسفی کانٹ کی کتاب (Critique of Pure Reason) امام غزالی کے فلسفے کی شرح لگتی ہے۔ یہی حال مسلمانوں نے ارسطو کی منطق کے ساتھ کیا۔ مثالیت (Idealism) نے بھی عرب تجربیت (Arab Empiricism) سے اثر قبول کیا۔ پھر کیا ہوا کہ مسلمان سو گئے اور پرانی کتب ہی مدارس میں پڑھاتے رہے جبکہ زمانہِ وسطیٰ میں نئے فلسفے متعارف ہوئے جن کا ہم نے مطالعہ و تدارک نہ کیا۔

مسلمان تخیلاتی نہیں بلکہ عملی تھے۔ قرآن نے انسان کو تجربیت و مشاہدہ سکھایا۔ قرآن نے بار بار کہا۔ کیا تم آسمان نہیں دیکھتے؟ کیا تم زمین نہیں دیکھتے؟ کیا تم جانور نہیں دیکھتے؟ یہ وہ

تعلیمات تھیں جنہوں نے مسلمانوں کو عملی سائنس کی طرف مائل کیا۔طبعیات میں ہم نے روشنی (Light) کا مطالعہ کیا۔ابوالہشیم نے جدید فزکس کی بنیاد رکھی۔الخوارزمی نے نویں صدی عیسوی میں (1037ء) دنیا کو جدید ریاضی کا علم دیا۔ابن سینا وز ہراوی (1013ء) نے جدید میڈیسن اور سرجری کی بنیاد رکھی۔تفصیل میں جائے بغیر یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ مسلمان سائنسدانوں نے دنیا کو جدید سائنس دی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تسخیرِ کائنات اور تسخیرِ ذات میں فرق نہ کرتے تھے۔ان کے ہاں اِس دنیا اور اُس دنیا کی تفریق نہ تھی وہ مادہ اور روح کی تقسیم کے قائل نہ تھے۔وہ قدیم وجدید علم کی بحث کو بے خبری سمجھتے تھے۔سائنسی علوم کی تحصیل سے مسلمان ٹیکنالوجی میں ماہر تھے۔فرانس کے عظیم بادشاہ شارلیمان کو گھڑی عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے بھجوائی تھی۔

پھر کیا ہوا؟ ہمیں نیند آ گئی ہم روایت میں الجھ گئے خرافات میں کھو گئے ہم نے دنیا و دین میں تفریق کر ڈالی۔ہم نے دنیاوی ترقی کو طلبِ دنیا سے تعبیر کیا۔اصل ٹھوس مادی علوم کو چھوڑ کر لذتِ سکر میں گم ہو گئے۔اور علمی موشگافیوں اور علم الکلام (Scholasticism) کی غیر ضروری بحثوں میں الجھ کر رہ گئے اور زمانہ حسبِ عادت ہمیں پیچھے چھوڑ کر چلا گیا۔

(تفصیلات اگلے باب میں ملاحظہ فرمائیں)

# تیسرا باب

# انسانی تہذیب پر اسلام کے اثرات

## (الف) اخلاقی اثرات

### (i) خدائی شعور

اسلامی انقلاب نے انسانی نفسیات اور سماجیات پر بہت گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ اسلام سے پہلے مذہب و فلسفے کا عمومی انسانی زندگی پر کوئی بہت زیادہ گہرا اثر نہ تھا۔ اخلاق و معاشرت عمومی طور پر مذہبیت سے زیادہ متاثر نہیں تھے۔ خدا کائنات کی تعمیر کے بعد الگ تھلگ تھا۔ لوگوں کے دل خدا کے خوف سے عاری تھے۔ اللہ کی محبت سے دور تھے خدا کے خوف اور محبت کو ایک عملی اور تخلیقی قوت کے طور پر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ یونانی فلسفہ بھی زیادہ تر ذاتِ باری کی صفات کے بارے میں منفی رائے رکھتا تھا۔ وہ اللہ کی بے پایاں رحمت، محبت و بخشش کے تذکروں سے نامانوس تھا۔ اور ہم سب جانتے ہیں کہ منفی جذبوں پر کوئی مثبت و جاندار تمدن قائم نہیں ہوسکتا۔

مسلمانوں نے اس بے جان اور بیمار معرفت سے انسانیت کو نجات دلائی۔ اللہ عز وجل کا وہ تصور دیا جو کہ روح و جان دونوں پر حاوی تھا۔ زندگی کی رگ رگ میں اترنے والا تھا۔ مسلمانوں کا رب رحمٰن تھا رحیم تھا پیار کرنے والا تھا، رازق تھا، اونچی شان والا تھا، کرم کرنے والا تھا، امن دینے والا تھا، نگہبان تھا، عظمت والا تھا۔ ساتھ ہمیں بھی حکم تھا کہ اللہ کی ان صفات کو اپنے اندر جذب کرنا ہے۔ اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگنا ہے کہ یہی سب سے بہتر رنگ ہے۔

اس سوچ نے کہ وہ مالک ہے۔ نظام چلا رہا ہے جزا و سزا دیتا ہے ایک شعوری زندگی کا تصور دیا جس میں خدا ایک زندہ حقیقت تھی۔ ایمان رگ و پے میں دوڑنے لگا۔ دماغ و دل اس سے منور ہونے لگے۔ ایک پاک صاف اور اجلی شخصیت سامنے آنے لگی۔ جو اللہ کے وجود کے احساس میں ڈوبی ہوتی تھی جو اس کی محبت میں سرشار تھی۔

### (ii) اخلاقی جرأت

اس روحانی فکر نے ایک اعلیٰ قوتِ ارادی عطا کی۔ ذاتی احتساب عطا کیا جو لغزشوں کی اصلاح کیلئے پیہم عمل تھا۔ ہر لمحہ روکنے والا نفس لوامہ عطا کیا جو رات کی تنہائی میں بھی نافرمانی سے روکتا تھا۔ لوگ خود آ کر کہتے کہ جناب ہم سے تنہائی میں یہ گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ مجھے سزا دیجئے یہ احتسابِ نفس تھا۔ یہ ضمیر کی ملامت تھی جس نے ہر مسلمان کے دل میں ڈیرے ڈال لیے اس اعلیٰ فکر سے امانت و دیانت کے اعلیٰ معیار بنے۔ پاکیزگی اور شرافت آئی جو جلوت اور خلوت میں یکساں موجود تھی۔ جس نے نفسانی ترغیبات و خواہشات پر قابو پالیا۔ اِنسان کیلئے غیر اللہ کے سامنے جھکنا مشکل ہو گیا۔ بادشاہ، عالم، جابر سب اللہ کی مخلوق نظر آنے لگے۔ اللہ کی ذاتِ عالی کی عظمت نے انسان کو ان تمام مخلوقات سے آزاد کر دیا۔ دنیا کا حسن و جمال، شان و شوکت، دربار کی عظمت، سب ہیچ ہو گئیں۔

تاریخ نے یہ بھی دیکھا کہ عرب فقیر قیصر و کسریٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے لگے۔ حضرت سعد بن وقاص نے رستمِ ایران (ایران کا سپہ سالار) کے پاس حضرت ربعی بن عامرؓ کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ جب وہ رستم کے دربار میں پہنچے تو دربار سجا تھا۔ تاج و تخت تھا۔ ریشم و حریر تھا۔ یاقوت و مرجان تھے۔ یہ اللہ والا غربت کے ہاتھوں تنگ تھا۔ مختصر سا لباس تھا۔ نیم مردہ سا گھوڑا تھا۔ محل میں وہ گھوڑے سے نہیں اترے۔ مخمل و کمخاب کے فرش پر چلتے

گئے۔ حتیٰ کہ گھوڑے کو دربار کے گاؤ تکیہ سے باندھ دیا۔ نیزے کو فرش پر مارتے مارتے رستم تک پہنچے۔ ارشاد فرمایا

> ہم کو اللہ نے اس لئے بھیجا ہے کہ جس کے بارے میں اس کی مرضی ہو اس کو بندوں کی بندگی سے نجات دلا کر اللہ کی بندگی میں داخل کریں دنیا کی تنگیوں سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں پہنچا دیں اور مذاہب کی زیادتیوں سے بچا کر اسلام کے عدل میں لے آئیں (البدایہ والنہایہ۔ ابن کثیر۔ جلد ۳)

یہ اخلاقی عظمت تھی یہ بے نیازی تھی۔ اللہ کی محبت و آخرت کی طلب نے عجب شجاعت بخش دی تھی۔ جنت کا شوق بھر دیا تھا دنیا حقیر بنا دی تھی۔ وہ دنیا و مافیا سے بے خبر ہو گئے تھے۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

### (iii) موت کی تمنا

معرکہ احد میں حضرت انس بن نضرؓ آگے بڑھے۔ انہوں نے حضرت سعد بن معاذ کو سامنے دیکھا تو فرمانے لگے کہ

> اے سعد! خدا کی قسم جنت کی خوشبو احد پہاڑ کے اس طرف سے آرہی ہے۔ انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ ہم نے اسی سے زیادہ زخم ان کے جسم پر پائے۔ جسم ٹکڑے ٹکڑے تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی کوئی شناخت نہ کر سکا۔ ان کی بہن نے انہیں ان کی انگلی کے پور سے شناخت کیا۔ (بخاری و مسلم)

غزوہ بدر میں آپؐ نے فرمایا بڑھو اس جنت کی طرف جس کی وسعت زمین وآسمان ہے۔تو حضرت عمر بن حمام انصاری نے کہا یارسول اللہ اس کی وسعت زمین وآسمان ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں،کیا تم کو شک ہے؟ کہنے لگے نہیں۔یارسول اللہ میری تمنا تھی کہ میں اس کو پالیتا آپؐ نے فرمایا کہ۔ہاں!ہاں! آپ اس کو پالو گے۔وہ چند دانے کھجور نکال کر کھانے لگے پھر فرمانے لگے اگر ان کھجوروں کے کھالینے کا انتظار کروں گا تو بہت ساوقت لگے گا۔پھر تمام کھجوروں کو پھینک دیا اور میدان میں کود پڑے اور شہادت پائی (مسلم)

موت کے آئینے میں دکھا کر رخ دوست
زندگی میرے لئے اور بھی دشوار کرے

### (vi) خودسپردگی

اس پاکیزہ فکر نے انسان کو مکمل سپردگی (Resignation) عطا کی۔اپنی ذاتی خواہشات سے دستبردار ہوکر وہ اللہ کا غلام بن گیا۔اپنی جان و مال کو اس کے سپرد کردیا۔جنگ اسی کیلئے ،صلح اسی کیلئے ،محبت اسی کیلئے ،نفرت اسی کیلئے ،ایمان کا ایک لمحہ ان کی کایا پلٹ دیتا تھا۔اچھی چیز بری بن جاتی تھی۔بری چیز اچھی بن جاتی تھی۔آپؐ خانہ خدا کا طواف کررہے تھے۔فضالہ بن عمیر آپؐ کو شہید کرنے کے ارادے سے آیا۔آپؐ نے فرمایا۔فضالہ کیا کرنے آئے ہو!اس نے کہا،کچھ نہیں،آپ نے تبسم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اللہ سے توبہ کرو۔پھر آپؐ نے اپنا دست مبارک ان کے سینے پر رکھا۔فضالہ کہتے ہیں کہ آپؐ کا ہاتھ جیسے ہی سینے سے اٹھا آپؐ مجھ کو ایسے محبوب لگنے لگے کہ دنیا میں سب سے زیادہ محبوب،واپسی پر مجھے وہ عورت ملی جس سے دل لگی کرتا تھا۔اس نے کہا کہ آؤ باتیں کریں۔میں نے کہا اللہ کی اطاعت اور اسلام کے بعد اب اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔(زادالمعاد۔جلد۲۔صفحہ نمبر 232)

### (v) معرفت

اللہ عزوجل کی ذات وصفات کے احساس، حیات کی ابتداء اور انتہا کے شعور اور حیات گزارنے کے ایک واضح لائحہ عمل نے انسان کو ایک صحیح معرفت عطا کی جس سے انسانی ذہن فلسفہ والہیات کی غیر ضروری جستجو سے بچ گیا۔ اس کی توانیاں سلامت رہیں۔ ان صلاحیتوں کو مسلمانوں نے دین و دنیا کے مفید کاموں میں صرف کیا اور دنیا کو ایک شاندار تمدن عطا کیا جس کی بنیاد اعلیٰ اخلاقی اقدار اور مادی سہولت تھی۔

### (vi) اجتماعی ذمہ داری

اسلامی فکر نے اجتماعی ذمہ داری (Collective Responsibility) کا تصور دیا۔ ظالم ومظلوم دونوں کی مدد کا حکم دیا۔ مظلوم کی مدد اس کی حمایت سے اور ظالم کی مدد اس کو ظلم سے روک کر (بخاری ومسلم) انفرادیت وقبائلیت نجس قرار پائی (بخاری) ہر آدمی دوسرے کا ذمہ دار تھا۔ ہر ایک کے حقوق وفرائض تھے۔

### (vii) محبت کا محور

محمد ﷺ کی شکل میں انسانیت کو حسن کا اعلیٰ نمونہ (Paragon of Beauty) مل گیا جسے اپنی ابدی محبت کا مرکز بنایا جا سکتا تھا۔ محبت ایک الوہی جذبہ ہے جس کی حیرت انگیز قوت کے ہزاروں نمونے دنیا میں موجود ہیں۔ دنیا میں کوئی بھی ایسا نقش نہیں ہے جس کی آبیاری محبت سے نہ ہوئی ہو۔ یہ حسین جذبہ دنیا کی چمک ودمک میں مست تھا۔ انسانیت طویل عرصہ سے کسی ایسی شخصیت سے محروم تھی جس کے در پر وہ اپنا دل و جان قربان کر سکے۔ آپؐ کی شکل میں انسانیت کو ایک طاقتور، حسین ترین اور کامل ترین شخصیت میسر آ گئی جو انسانیت کا مرکز تھی۔ جو آپ کو دور سے دیکھتا مرعوب ہو جاتا، قریب سے دیکھتا تو فریفتہ ہو جاتا، دل چاہتا ہے یہاں نعت کے چند اشعار درج کروں جو میری رائے میں حقیقت کے قریب تر ہیں۔

بلغ العلیٰ بکمالہ کشف الدجیٰ بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ صلو علیہ وآلہ

(انسانی عظمت آپ کی ذات میں اپنے کمال تک پہنچی۔ آپ کے حسن وکمال کی روشنی سے اندھیرے چھٹ گئے۔ آپ میں تمام اعلیٰ انسانی خوبیاں تھیں۔ اللہ عزوجل آپؐ پر اور آپؐ کی آل پر سلام بھیجتے ہیں)

ایک انصاری عورت جس کا باپ، بھائی اور شوہر احد کے روز رسول اللہ کے ساتھ تھے اور شہید ہو گئے تھے اپنے گھر سے نکل کر پوچھنے لگی! رسول اللہ کا کیا حال ہے؟ لوگوں نے کہا، اللہ کے فضل سے خیریت سے ہیں؟ اس نے کہا میں آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس نے جب آپ کو دیکھ لیا تو بولی۔ اگر آپ سلامت ہیں تو ہر مصیبت ہیچ ہے۔ (ابن اسحاق)

حضرت خبیبؓ کو پھانسی کے تختہ پر چڑھایا گیا۔ سب کہنے لگے کہو یہ پسند ہے کہ محمدؐ تمہاری جگہ ہوں؟ انہوں نے کہا کہ اللہ عزوجل کی قسم میں اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ آپؐ کے پیر میں کانٹا چُبھے اور میں چھوڑ دیا جاؤں۔ وہ سب ہنس دیئے (البدایہ والنہایہ۔ جلد چہارم صفحہ 63)

عروہ بن مسعود ثقفی (جو کفارِ مکہ کا سفیر تھا) نے حدیبیہ سے واپسی کے بعد اپنے ساتھیوں سے کہا۔ اے لوگو! خدا کی قسم، میں نے بہت سے بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں۔ قیصر وکسریٰ کے دربار دیکھے ہیں۔ نجاشی کا دربار بھی دیکھا ہے۔ خدا کی قسم میں نے ایسا بادشاہ نہیں دیکھا جس کے ساتھی اس کی اتنی عزت کرتے ہیں جتنی محمدؐ کے ساتھی محمدؐ کی۔ خدا کی قسم جب وہ تھوکتے ہیں لوگ اس کو اپنے جسم پر مل لیتے ہیں۔ جب وہ ان کو حکم دیتے ہیں وہ تو سب ان کے حکم پر لپکتے ہیں جب وہ وضو کرتے ہیں تو اس کے پانی پر لڑتے لڑتے رہ جاتے ہیں۔ جب بات کرتے ہیں تو لوگ اپنی آوازیں پست کر لیتے ہیں۔ اور وہ لوگ فرطِ ادب سے آپؐ پر گہری نظر نہیں ڈال سکتے۔ (زادالمعاد۔ جلد دوم۔ صفحہ 125)

انسانیت کو اپنی محبت کے اظہار کیلئے ایک نقطہ مل گیا تھا۔ جہاں وہ اپنے اعلیٰ جذبات قربان کر سکتے تھے۔فطری جذبے کی تسکین کر سکتے تھے۔ جذباتی انتشار سے بچ گئے۔ پاکیزگی اور لطف وعنایت نے ایک عمدہ شکل دیکھی۔محبت واطاعت کی نئی روایات قائم ہوئیں۔محبت کے تخلیقی عمل سے کمالات نے جنم لیا۔ لازوال نقوش جنم لینے لگے۔محبت فاتحِ عالم بنتی چلی گئی۔

### (viii) شخصی عظمت

ان نفسی و اخلاقی عوامل سے اِنسان بدلنے لگے۔جان بلب انسانیت میں نئی زندگی پیدا ہوگئی۔دبی صلاحیتیں اجاگر ہوگئیں۔ان صلاحیتوں کو ایک مرکز مل گیا۔عربوں کی بربادشدہ قوم میں عظیم الشان انقلاب آ گیا۔حضرت عمر جو بکریاں چراتے تھے اس تعلیم وتربیت سے سیدنا عمر کہلائے۔تمام دنیا کو اپنی عظمت سے حیران کر گئے۔تقویٰ اور حکومت کے مجسم پیکر بن گئے۔خالد بن ولید عام نوجوان تھے۔وہ اللہ کی تلوار بن گئے۔اور روم پر بجلی بن کر گرے۔ابو عبیدہ عام نرم مزاج کے انسان تھے۔ہرقل کو ملکِ شام سے روانہ کرتے ہیں۔عمرو بن عاص اچھے سمجھدار تھے مگر اب مصر کے حاکم بنتے ہیں۔سعد بن ابی وقاص اوسط درجے کے انسان تھے۔مدائن میں عراق وایران کو زیر کرتے ہیں۔غلام ابن غلام،سلمان فارسی،اپنے ہی ملک کے حاکم بنتے ہیں مگر جھونپڑی میں رہتے ہیں۔یہ چھوٹے قد والے حضرت علیؓ ہیں۔عظیم ترین عالم بنے۔علم کی نہریں بہاتے ہیں۔

یہ سب کچھ کیا ہے؟ لگتا ہے کہ کسی نے انسانیت کے ویران خانے میں پہلے دعوت و محبت کے تار بچھائے اور پھر اس میں ایمان کی بجلی جاری کر دی تو بے جان بلب روشن ہو گئے اور دنیا کو روشن کرنے لگے۔ یہ قوت، یہ کمال، انسانیت پر بہت بڑا احسان تھا کہ چرواہوں کو تبدیل کر کے خلیفہ بنا دیا گیا۔ یہ انسانی تبدیلی کا عمل (Metamorphosis) غیر معمولی تھا، مثالی تھا، اور رہتی دنیا تک ایک انقلابی عمل تھا۔

اس طرح کے کمالات ان پاک نفسوں نے اجتماعی زندگی میں بھی کئے۔ وہ حق وانصاف کے علم بردار بن گئے۔ ذاتی خواہشات، جاہ وجلال اور عبادت نے ان کی انصاف پسندی میں کوئی کمی پیدا نہیں ہونے دی۔ وہ عہدوں اور حکومتوں سے بھاگتے تھے۔ گریزاں تھے۔ اگر ذمہ داری مل جاتی تو اسے مقدس امانت سمجھتے۔ وہ کسی نسلی یا علاقے کے نمائندے نہ تھے بلکہ پوری انسانیت کے خیر خواہ تھے۔ انسانی شرف کے داعی تھے۔ مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاص کے بیٹے نے ایک عام مصری شہری کو ایک بار کوڑا مارا اور کہا کہ وہ گورنر کے بیٹے ہیں سیدنا عمر نے حکم دیا کہ مصری اس گورنرزادے سے بدلہ لے اور لڑکے کے باپ (گورنر) سے کہا کہ تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا ہے۔ حالانکہ وہ اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے ہیں۔ (تاریخ عمر بن خطاب۔ علامہ ابنِ جوزی۔ صفحہ 2)

## (ب) علمی اثرات

### (i) سائنسی فکر

اسلام سے پہلے تو لوگ فطرت کے مظاہر کو پوجتے تھے اور یہی شرک تھا۔ اسلام نے فطرت کے مطالعہ تلاش و جستجو کا حکم دیا جس سے سائنسی عمل شروع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سے پہلے دنیا میں تجربی سائنس جنم نہ لے سکی۔ اسلام سے پہلے تو کائنات انسان کیلئے عبادت کا موضوع (Object of worship) تھی۔ اسلام نے اس کو تحقیق کا موضوع (Object of Investigation) بنایا۔ یہ اسلام کا بہت بڑا سائنسی و علمی کارنامہ ہے جس نے تاریخِ انسانیت کو یکسر بدل دیا۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا میں لکھا ہے۔

> A widespread phenomenon in religions is the identification of natural forces and objects as divinities. It is convenient to classify them as celestial, atmospheric, and earthly. This classification itself is explicitly recognized in Indo-Aryan religion: Surya, the sun god, is celestial; Indra, associated with storms, rain, and battles, is atmospheric; and Agni, the fire god, operates primarily at the earthly level (Vol.14,P-785).

اسلام نے دنیا کو سائنسی معیار دیا۔ اسلام سے پہلے لوگ پرانی علمی روایتوں کو بغیر تجربے کے مان لیتے تھے۔ رسل نے صحیح کہا ہے کہ یونان والے تجربے اور مشاہدے کے خلاف تھے۔ یونان کے سب سے بڑے فلسفی اور سائنسدان ارسطو (Aristotle) کی رائے میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے دانت کم ہوتے ہیں۔ اس کو یہ بھی خیال نہ آیا کہ اپنی دو بیویوں میں سے کسی کا منہ کھول کر دیکھ ہی لیتا۔

"To modern educated people, it seems obvious that matters of fact are to be ascertained by observation, not by consulting ancient authorities. But this is an entirely modern conception, which hardly existed before the seventeenth century. Aristotle maintained that women had fewer teeth than men; although he was twice married, it never occurred to him to verify this statement by examining his wives mouth."
(Russell, The Impact of Sciences on Society, P.17)

بریفالٹ تو یہاں تک کہتا ہے کہ جدید سائنس خود اسلام کی پیدا کردہ ہے۔ اہل یونان نے سائنس شروع کی لیکن با قاعدہ سائنسی طریقہ، تجربات و تحقیق عربوں نے ایجاد کئے۔ یہی فکر ہے جس نے بعد میں یورپ میں سائنسی انقلاب برپا کیا۔ بریفالٹ کی رائے میں:

The debt of our science to that of the Arabs does not consist in startling discoveries of revolutionary theories; science owes a great deal more to Arab culture, it owes its existence. The ancient world was, as we know, pre-scientific. The Astronomy and Mathematics of the Greeks were a foreign importation never thoroughly acclimatized in Greek culture. The Greeks systematized, generalized, and theorized, but the patient ways of investigation, the accumulation of positive knowledge, the minute method of science, detailed and prolonged

observation and experimental inquiry were altogether alien to the Greek temperament. Only in Hellenistic Alexandria was any approach to scientific work conducted in the ancient classical world. What we call science arose in Europe as a result of a new spirit of inquiry, of new methods of investigattion, of the method of experiment, observation, measurement, of the development of Mathematics in a form unknown to the Greeks. That spirit and those methods were introduced into the European world by the Arabs.

(Briffault, Making of Humanity. P.190)

موجودہ زمانے میں ہم سائنس وٹیکنالوجی کی تعلیم میں بہت پیچھے ہیں۔حالانکہ قرآن کریم میں زمین وآسمان کی چیزوں پر غور کرنے پر بہت زور دیا گیا ہے اور یہی سائنس ہے اور اس سے معرفت پیدا ہوتی ہے۔مسلمانوں کی تاریخ بھی اس بات پر گواہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں مسلمانوں نے سائنس میں بہت ترقی کی۔عہد حاضر کے مشہور برطانوی مفکر وفلسفی برٹرینڈ رسل نے اس حقیقت کا برملا اظہار کیا ہے کہ جس زمانے میں یورپ میں سائنس کی ابتداء نہیں ہوئی تھی اور یورپ 'تاریک زمانے(Dark Age)' میں تھا اس وقت ہندوستان سے لیکر سپین تک اسلام کی شاندار تہذیب چھائی ہوئی تھی۔

"Our use of the phrase ' the Dark Ages' to cover the period from 600 to 1000, marks our undue concentration on Western Europe. In China, this

period includes the time of the Tang Dynasty, the greatest age of Chinese poetry and in many other ways a most remarkable epoch. From India to Spain the brilliant civilization of Islam flourished. What was lost to Christendom at this time was not lost to civilization, but quite the contrary."
(Bertrand Russel "A History of Western Philosphy. P.372)

### (ii) طب

قرونِ وسطیٰ(Middle Ages) میں مسلمانوں نے سائنس میں حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیئے۔ الرازی (932ء)اور ابن سینا(1037ء)اپنے زمانے کے سب سے بڑے طبیب(Physician) تھے۔ ابن سینا کی کتاب 'القانون' 1650ء تک یورپ کے نصاب میں شامل تھی۔

الزہراوی کی کتاب التصریف کا سرجری سے متعلق گیراڈ آف کریمونا نے عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔ یورپ میں اس کے مختلف ایڈیشن چھپے۔ وینس(venice) میں 1497ء میں باسل (Basel) میں 1541ء میں اور آکسفورڈ میں 1778ء میں چھپا۔ یہ ترجمہ کئی صدیوں تک یورپ کے میڈیکل سکولوں میں بطورِ نصاب پڑھایا جاتا رہا۔(Hitti-P577)

عربوں نے دواؤں کے علم(Pharmacology) کو ترقی بخشی انہوں نے تقطیر (Distillation) اور تصعید(Sublimation) جیسے عمل ایجاد کئے جو جدید دواسازی کی بنیاد ہیں۔ الزہراوی کی سرجری سے متعلق کتابیں 1778ء میں آکسفورڈ نے چھاپیں۔

الرازی(925ء)اور ابن سینا(1037ء) کی تصاویر اب بھی پیرس یونیورسٹی کے سکول آف میڈیسن کے بڑے ہال میں سجی ہوئی ہیں۔ مساویہ(857ء) نے دنیا میں سب سے پہلے آنکھوں کی امراض(Ophthalmology) کی کتاب عشر مقالات فی العین(آنکھ پر دس مضامین) لکھی۔(Hitti, P.364)

### (iii) کیمیا

جابر بن حیان(776ء) جدید علم کیمیا(Chemistry) کا بانی ہے۔ اس نے کیمسٹری میں تکسید(Calcination) اور تخفیف(Reduction) کے عمل کے فارمولے بنائے۔ اس نے عمل تبخیر(Evaporation) عمل تصعید(Sublimation) پگھلانے(Melting) اور قلم پذیری(crystallization) کے عمل کے فارمولے کو بہتر کیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے گندھک کا تیزاب(Sulphuric acid) اور شورے کا تیزاب(Nitric acid) بنائے۔

### (iv) ریاضی

الخوارزمی (850ء) کی کتاب حساب الجبر والمقابلہ (The calculation of Integration and Equation) الجبراء کی پہلی کتاب ہے جس کا بارھویں صدی میں ترجمہ ہوا اور کئی صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں بطور نصاب پڑھائی جاتی رہی۔ اس نے عربی نمبر(Algorisms) بھی متعارف کروائے۔

مسلمانوں نے علم الحساب (Arithmatic) کو نئی جہتیں دیں۔ اعداد (Numbers) کے حساب کو ترتیب دی۔ الخوارزمی نے نویں صدی میں صفر(Zero) کا پہلی بار استعمال کیا۔ البیرونی (1040ء) ابنِ سینا (1037ء) الکرفی (1029ء) اور ابوسعید سجزی(1024ء) وغیرہ نے عددِ تام (Perfect Numbers)، متعادلان

(Equivalents) متحابان (Amicable Numbers) اورمثلثات (Triangular
Numbers) وغیرہ بنائے۔اسی طرح مربع (Square) کےقوانین بنائے۔اس علم میں
مسلمانوں کے کمال کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ البیرونی نے (1040ء) میں
$16^{16}$-1 کی صحیح قدر (value) معلوم کر لی تھی۔حالانکہ اس زمانے میں حساب کرنے والی
مشینیں(calculators)ایجادنہیں ہوئے تھے۔(Sharif, P-1279)

مسلمانوں نے الجبرا (Algebra) کو بھی کمال بخشا۔الخوارزمی(850ء) نے
Algoritham بنایا۔اس نے پہلے اور دوسرے درجے کی الجبریاتی مساواتیں بنائیں۔ابراہیم
سنان(946ء) جدید Integral Calculus کا بانی کہلایا جاسکتا ہے۔ابووفا(998ء) نے
چوتھے درجے کی مساواتیں (Algebric Equation) اورالبیرونی نے عمل (Function)
کورواج دیا جو Leibniz (سترھویں صدی) کی ریاضی کے بعداس مضمون میں سب سے اہم
مسئلہ ہے۔اس طرح الفخری نے Square roots اور Theory of Indices وغیرہ معلوم
کیں۔عمر خیام نے گیارھویں صدی میں Binomial Expression for positive
Integral دریافت کیں جس کی بنیاد پر نیوٹن نے سترھویں صدی میں اپنا Binomial
Theorem پیش کیا۔اس طرح مسلمانوں نے Geometry اور Trignometry میں بھی
کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔(Sharif,Vol. 2, P-1283)

عمرخیام(1124ء) نے ایک کیلنڈر بنایا جوگریگوری(Gregorian) کیلنڈر سے بھی
زیادہ بہتر ہے۔گریگوری کے کیلنڈر میں 3330 سالوں میں ایک دن کی غلطی ہوتی ہے۔جبکہ
خیام کے کیلنڈر میں 5000 سالوں میں ایک دن کی غلطی آتی ہے۔(Hitti-P.377)

## (v) ہیئت

مسلمانوں نے علم ہیئت (Astronomy) میں بھی کمال پیدا کیا۔ بہت سے ستاروں کے نام اور اصطلاحات عربی زبان سے آئیں ہیں چند مثالیں پیش ہیں۔

### ستاروں کے نام

| ستارے کا نام/اصطلاحات | عربی ماخذ (Origin) |
|---|---|
| Acrab | عقرب (Scorpion) |
| Algedi | الجدی (The Kid) |
| Altair | الطیر (The Flyer) |
| Deneb | ذنب (Tail) |
| Pherkad | فرقاد (Calf) |
| Azimuth | السموت |
| Nadir | نذیر |

(Hitti, P.572-3)

## (vi) جغرافیہ

مسلمانوں نے جغرافیائی سائنس میں بھی کمال پیدا کیا۔ فلپ ہٹی نے لکھا ہے کہ الادریسی بارھویں صدی بلکہ قرونِ وسطیٰ کا سب سے بڑا جغرافیہ دان تھا۔ یورپ کے ممالک کے حکمران اس سے نقشے بنواتے تھے۔ ادریسی سسلی (Sicilly) کے نارمن بادشاہ راجر دوئم (Ruger-II) کا ذاتی دوست اور مشیر تھا۔ ادریسی نے راجر کے دربار میں سرکاری نقشہ نویس کی حیثیت سے کام کیا اور اس کیلئے 1154ء میں دنیا کا نقشہ بنایا۔ (انسائیکلوپیڈیا جلد 11 صفحہ 472) البیرونی نے موجودہ پاکستان کے علاقے میں زمین کے قطر (Radius) کی پیمائش کی جو عہدِ حاضر کے تسلیم شدہ قطر سے صرف 15 کلومیٹر کم ہے۔

جغرافیہ کے علم نے مسلمانوں کو سیاحت وسمندری سفر میں دسترس بخشی یہاں تک کہ یورپ اور ہندوستان کے درمیان سمندری راستہ کی دریافت بھی مسلمان ملاحوں کی مرہون منت ہے۔ واسکوڈی گاما (1524ء) ایک پرتگالی ملاح تھا۔ اس نے 1697ء میں ہندوستان اور یورپ کے درمیان راستہ دریافت کیا جو Cape of Good Hope سے ہوکر جاتا تھا یہ عظیم کامیابی اس کو ایک عرب ملاح احمد بن ماجد کے ذریعے حاصل ہوئی۔ یہ ملاح اس کو موزنبیق کے سلطان نے مہیا کئے تھے (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا۔ جلد 7 صفحہ 761)

امریکہ کی دریافت میں بھی مسلمانوں کا ہاتھ ہے۔ یہ عظیم دریافت کولمبس (1506ء) نے کی۔ ہٹی نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے زمین کے گول ہونے کے قدیم نظریے کو زندہ رکھا جس کے بغیر امریکہ کی دریافت ممکن نہ تھی۔ اس نظریہ کا ایک مبلغ ابوعبیدہ مسلم البالیینی تھا جس نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ اس کا زمانہ دسویں عیسوی کا نصف اوّل ہے۔ زمین کے گول ہونے کا نظریہ عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہوکر 1410ء میں یورپ میں شائع ہوا۔ اس کو پڑھ کر کولمبس نے اس نظریہ سے واقفیت حاصل کی۔ (Hitti, P.570)

### (vii) قانون

علم قانون میں مسلمانوں نے شاندار کارنامے سرانجام دیئے۔

(1) اصولِ قانون خالصتاً مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ قانون تو روم، یونان، چین، ہندوستان وعراق وغیرہ میں اسلام کی بعثت سے بہت پہلے موجود تھا مگر اصول قانون (Jurisprudence) کی ابتداء امام ابوحنیفہ نے (156ھ) کتاب الرائی سے کی۔ ان کے شاگرد امام ابو یوسف نے کتاب الاصول لکھی اور امام شافعی (767ء) نے انسانی تاریخ میں پہلی بار اپنی کتاب الرسالہ فی اصول الفقہ میں اصولِ قانون، قانون سازی، تعبیر کے اصولوں وغیرہ پر باقاعدہ سیر حاصل بحث کی۔

(2) مسلمانوں نے ہی قوانین کا تقابلی مطالعہ (Comparative Law) شروع کیا۔

(3) قانون میں نیت (Intention) کی اہمیت پہلی بار مسلم قانون دانوں نے بیان کی۔اب ہم غلط نیت (Mens Rea) کے بغیر کسی جرم کو جرم نہیں مانتے۔

(4) مسلمانوں نے قانون کو اخلاقی بنیاد مہیا کی۔

(5) بین الاقوامی قانون کے علم کی باقاعدہ ابتداء امام ابوحنیفہ کے استاد امام زید بن علی (120ھ) نے اپنی کتاب المجموعہ سے کی۔امام محمد الشیبانی نے اس موضوع پر دو کتابیں کتاب السیر الصغیر اور کتاب السیر الکبیر لکھیں۔جن کا انگریزی ترجمہ امریکن یونیورسٹی آف بیروت کے عیسائی پروفیسر مجید خدوری نے کیا ہے اور دستیاب ہے۔امام سرخسی نے اس کتاب کی شرح چار جلدوں میں لکھی ہے۔یہ کتاب Oppenheim کی کتاب انٹرنیشنل لا (بین الاقوامی قانون) سے بھی بڑی ہے۔اسلئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ بین الاقوامی قانون پر پہلی باقاعدہ کتاب ولندیزی عالم ہو گوگروشیئس (Hogo Grotiues) نے 1645ء میں لکھی تھی جس کا نام De Jure Belli ac Pacis (Law of War and Peace) ہے۔

### (viii) دیگر علوم

مسلمانوں نے فنونِ لطیفہ کو فروغ دیا۔خاص طرز کی مصوری کو فروغ دیا۔خوش نویسی (Calligraphy) کو متعارف کرایا۔کشیدہ کاری اور قالین سازی کی بنیاد رکھی۔لکڑی،ہاتھی دانت اور ہڈیوں پر نقاشی اور کندہ کاری کو رواج دیا۔

کاغذ بنا کر مسلمانوں نے دنیا پر احسان کیا۔مراکش میں کاغذ بننا شروع ہوا۔وہاں سے ہوتا ہوا سپین اور یورپ پہنچا۔کاغذ کے بغیر کتابیں نہ پھیل سکتیں۔کاغذ کے پیمانہ کا لفظ ریم (Ream) بھی عربی زبان سے آیا ہے۔

آج اگر اسلام آباد کے میریٹ ہوٹل میں جائیں تو ہر دوسرا آدمی کوئی غیر ملکی ماہر (Consultant) ہوگا۔ایک وقت تھا کہ ہم مغرب کو ماہرین مہیا کرتے تھے۔انگلستان کے بادشاہ Offa Rex (796ء) نے سونے کے سکے ڈھلوانے کیلئے بغداد سے سکہ گر بلائے تھے۔ وہ سکے اب بھی برٹش میوزیم لندن میں موجود ہیں جس میں ایک طرف تو بادشاہ کا نام لکھا ہوا ہے تو دوسری طرف عرب سکہ گر کا نام ہے۔

## (ix) مغرب کو علم کی منتقلی

مسلمانوں کے یہ علوم سسلی، سپین اور روم کی وساطت سے پورے یورپ میں پھیل گئے۔گیراڈ آف کریمونا (Gerard of Cremona) (1187ء) اور مائیکل سکاٹ (Michael Scot) نے مسلمانوں کے کاموں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کر کے ان کو یورپ کیلئے مفید بنایا۔سپین کے شہر تولیدو (Toledo) میں 1135ء سے 1284ء تک مسلمانوں کی اکثر اہم کتب کے یورپی زبانوں میں ترجمے ہو چکے تھے۔Robert of Chester نے 1145ء میں خوارزمی کی کتاب الجبراء کا ترجمہ کیا۔اڈیلارڈ (Adelord of Bath) نے 1126ء میں المجریتی کی ہیئت (Astronomy) سے متعلق کتابوں کا ترجمہ کیا۔مائیکل سکاٹ نے 1236ء میں ابن رشد کی کتب فلسفہ اور ابنِ سینا کی حیاتیات سے متعلق کتب کے تراجم کئے۔گیراڈ آف کرمونا (Gerad of Cremona) نے کل 71 کتب کے ترجمے کئے۔

مسلمانوں کے ان علمی کارناموں کا مغربی فکر پر بہت گہرا اثر پڑا

(i) اس سے انسان دوستی کی تحریک (Humanistic Movement) شروع ہوئی۔

(ii) تاریخی علوم (Historical Sciences) شروع ہوئے۔

(iii) سائنسی تجربہ و مشاہدہ شروع ہوا۔

(iv) فلسفہ اور عقیدہ میں باہمی تفہیم پیدا ہوئی۔
(v) تصوف کی تحریک نے جنم لیا۔
(vi) اٹلی میں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کی تحریک شروع ہوئی
(vii) کانٹ (Kant) تک مغربی فکر اسلامی فکر سے متاثر رہی وغیرہ۔

مسلمان انسان دوست تھے انہوں نے مغرب کو انسان دوستی کا سبق دیا۔ انہوں نے اہل مغرب کو بتایا کہ عیسائیت سے باہر بھی انسانیت ہے۔ انہوں نے یونان کے علوم کو پڑھا۔ سمجھا اور یورپ کو منتقل کیا۔ بغداد میں دارالحکومت قائم ہونے کے آٹھ سال کے اندر اندر مسلمانوں نے یونان کا تمام ذخیرہ علم وکتب اپنے ہاں جمع کر لیا۔

قرآنِ پاک کا بہت سا حصہ پرانی قوموں کے عروج وزوال سے بحث کرتا ہے۔ اور تاریخ کو علم کا ایک حصہ مانتا ہے۔ اس لئے مسلمانوں میں ہیروڈوٹس (Herodotus) کے بعد پہلی بار طبری (923ء) یعقوبی (872ء) البیرونی (1040ء) مسعودی (957ء) اور ابن خلدون (1406ء) جیسے تاریخ دان پیدا ہوئے۔ البیرونی نے پہلی بار تاریخ پر تنقید کے اصول متعارف کرائے۔

ابن خلدون کا مقدمہ بہت مشہور ہے۔ اس کتاب میں اس نے انسانی تاریخ میں پہلی بار تاریخی ترقی کے اصول بیان کئے۔ تاریخ پر موسم، ماحول، اخلاقی اور روحانی قوتوں کے اثرات کا جائزہ لیا۔ اس نے قوموں کی ترقی وتنزلی کے قوانین بنائے۔ اس لئے انہیں بجا طور پر جدید تاریخ وعمرانیات (Sociology) کا بانی کہا جاتا ہے۔

مسلمانوں کا مغرب پر سب سے بڑا احسان سائنسی اور استخراجی (Scientific and Inductive) طریقِ تحقیق ہے۔ بریفاٹ نے لکھا ہے کہ آکسفورڈ یونیورسٹی اور راجر بیکن

بنیادی طور پر عربوں کے علوم کے زیر اثر آگے بڑھے۔

(The Making of Humanity, 1928, P.200)

مغرب میں پندرھویں صدی تک سائنس اور فلسفہ کی تعلیمات کو مذہب کے خلاف سمجھا جاتا تھا اسی لئے ارسطو اور ابن سینا کی تعلیمات یہاں ممنوع تھیں۔ برونو (Bruno) کو جلا دیا گیا۔ کیپلر (Kepler) کو سزا دی گئی۔ گیلیلیو کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے نظریات سے لاتعلقی کا اظہار کرے۔ اس کے برعکس مسلمان معاشرے میں سائنس مذہب میں ہم آہنگی پیدا کی گئی جس کے سبب یہاں سائنس اور فلسفہ نے ترقی پائی اور پھر مغرب نے بھی اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

مغربی علماء عام طور پر یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ مغرب اسلامی تصوف سے بہت متاثر ہوا ہے۔ گوئٹے (Goethe) پر ایران کی صوفیانہ شاعری کا بہت گہرا اثر ہے۔ دانتے (Dante) کی Divine Comedy پر ابن عربی کا سایہ ہے۔

(Sharif, Vol.2, P-1338-40)

## چوتھا باب

# عہد جدید کے چیلنج

آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ زمانۂ اوّل کے مسلمان اپنے عہد کے تمام چیلنجوں سے سرخرو ہوئے۔ انہوں نے انسانی فکر اور عمل کو آگے بڑھایا۔ زمانے کی قیادت کی لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ داستان کہتے کہتے سو گئے۔ زمانہ وسطیٰ اور عہدِ حاضر کے چیلنجوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ یورپ اور مغرب نے مسلمانوں کی علمی تحریک سے فائدہ اٹھایا اور پھر اسے آگے لے کر چلے۔ ویسے ہی جیسا کہ مسلمان یونان کی علمی تحریک کو آگے لے کر چلے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی قریب میں انسانی فکر و عمل نے کیا ترقی کی اور ہمارا ردِ عمل کیا تھا؟

### (i) سائنس

سولھویں اور سترھویں صدری عیسوی میں نیوٹن نے پرانی طبعیات کو یکسر بدل دیا جس سے حرکت کے نئے قوانین سامنے آئے اور سائنسی انقلاب کی بنیاد رکھی گئی۔ کاپرنیکس اور گیلیلیو نے نظام شمسی کے پرانے تصورات بدل دیئے۔ انجن کی ایجاد نے حیاتِ انسانی کو نہ ختم ہونے والی حرکت عطا کی۔ پرنٹنگ پریس نے علم کو عالموں کے سینے سے نکال کر عوام تک پہنچایا۔ پنسلین جیسی دوائیوں نے موت و حیات میں فاصلہ بڑھا دیا۔ تیر و تلوار کی جگہ نوبل کے بارود نے لے لی اور پھر ذرے کے دل کو چیر کر ایٹمی توانائی حاصل کر لی گئی۔ بادبانی کشتیوں کی جگہ دیوہیکل جہازوں نے لے لی اور پھر ہوائی جہاز آ گئے۔

آپ افغانستان و عراق کی جنگ کی مثالیں دیکھیں۔ تورابورا پر حملہ کرنے والے جہاز امریکہ سے اڑتے تھے اور بغیر راستہ میں رکے یہاں قیامت برساتے تھے۔ امریکہ میں لگے

آلات قندھار میں ہونے والی گفتگو سن لیتے تھے۔ دجلہ وفرات کے پلوں کے صرف ان ستونوں پر بمباری کی گئی جہاں مواصلاتی تار تھے۔ اس مہارت سے جیسا کہ دنیا کے سب سے اعلیٰ سرجن نے کوئی آپریشن نہایت مہارت سے کیا ہو۔

ہم یہاں دعا کرتے رہے کہ اللہ کرے کہ امریکہ کے جہاز کالے کوے سے ٹکرا کر تباہ ہو جائیں اور ان کی توپوں میں کیڑے پڑ جائیں۔ ہم یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ اللہ کا نظام ایک ضابطے سے چلتا ہے۔ اور ہم یہ ضابطہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

مغرب نے وہی علم استعمال کیا جو ہم سے لیا۔ لیکن اس علم کو آگے بڑھایا لیکن ہم وہیں کے وہیں رہے۔ مثال کے طور پر مدرسوں میں آج بھی اقلیدس کی کتاب ریاضی پڑھائی جاتی ہے۔ یہ کتاب حضرت عیسیٰؑ سے بھی پہلے لکھی گئی تھی۔ اس میں بہت تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ آج سے چند سال پہلے پاکستان میں ایف ایس سی میں ریاضی کی کتاب اس اقلیدس کی ترقی یافتہ شکل تھی جس سے طالب علم انجینئر بن جاتے ہیں لیکن مدارس کا فارغ التحصیل عالم سائنس سے ناواقف ہوتا ہے۔ ہم ابھی تک پڑھاتے ہیں کہ دنیا میں عناصر اربعہ (Four Elements) یعنی آگ، مٹی، پانی اور ہوا ہے۔ لیکن مغرب نے دیکھ بھال کر عناصر کی تعداد ایک سو دس کر دی اور ایک عنصر یورینیم کو چیرا اور ایٹم بم بنالیا۔ اور ہم عناصر اربعہ کے چکر میں ہیں۔ ہم میں اور مغرب میں اتنا ہی فرق ہے جتنا 4 اور 110 میں ہے یا جتنا مٹی اور یورینیم میں ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر (1707ء) نصف صدی تک ہندوستان کا بادشاہ رہا۔ اس کے پاس بہت وسائل تھے۔ معروف معنوں میں دیندار تھا۔ اس کا زمانہ وہ زمانہ ہے جس میں مغرب میں جدید سائنس وفلسفے کی ابتداء ہوئی۔ اس کے اثرات اس کی سلطنت تک پہنچ چکے تھے۔ واسکوڈی گاما 1499ء میں کالی کٹ میں اتر چکا تھا۔ اس نے اہل مغرب کو ایشیاء کا راستہ

دکھا دیا تھا۔ 1510ء میں پرتگال نے ہندوستان کے ساحلی علاقے گوا پر قبضہ کرلیا تھا۔ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی جس نے بعد میں سراج الدولہ اور ٹیپوسلطان کو شکست دیکر ہندوستان پر سیاسی قبضے کی ابتداء کی 1600 سے یہاں کام کررہی تھی۔لیکن اورنگ زیب ان خطرناک سیاسی حقائق سے مطلقاً بے خبر رہا۔ 1620ء میں ہالینڈ کے شہر ایمسٹرڈیم میں پرنٹنگ پریس لگ چکا تھا۔ ہمارے ہاں بادشاہ سلامت اپنے متبرک ہاتھ سے قرآن مجید لکھنا کمال سمجھتے تھے۔ یورپ میں 1455ء میں انجیل مقدس پریس سے چھپ چکی تھی۔اورنگ زیب سے یہ بھی نہ ہوسکا کہ قرآن پاک کی اشاعت ہی کیلئے پرنٹنگ پریس لگوا لیتا۔ پیرس اور آکسفورڈ یونیورسٹی بارھویں صدی میں بن چکی تھی۔اورنگزیب نے یہ کام اٹھارویں صدی میں بھی نہ کیا۔ ( فکر اسلامی۔صفحہ 171 )

جدید علوم سے یہ بے خبری تھی کہ 1857ء میں انگریز فوج کی تعداد صرف پنتالیس ہزار تھی جبکہ مسلمان فوج کی تعداد اڑہائی لاکھ تھی لیکن پھر بھی شکست ہمارا مقدر بنی اس لئے کہ ہم نے جدید علوم سے بے خبر تھے اور انگریز کے پاس توپ اور ٹیلی گرام تھے۔ہم ایک چھاونی سے دوسری چھاونی میں اپنے پیغام کبوتر کے ذریعے بھیجتے تھے وہ ٹیلی گرام کی تاریں استعمال کرتے تھے۔نتیجہ تو یہی نکلنا تھا جو نکلا۔ ( فکر اسلامی۔صفحہ 180 )

### (ii) جمہوریت

انسانی معاشرے کے ہَیتِ اجتماعی کیلئے مغرب نے شورائیت کے اصول کو اپنایا۔ برطانیہ کے شاندار انقلاب (1688) نے یہ اصول طے کردیا کہ بادشاہوں کو غیر معمولی اختیارات نہیں ہیں بلکہ قانون کی حکمرانی زیادہ اہم ہے اور قانون عوام بناتی ہے۔ یہ طے ہوگیا کہ حکومت کرنا خدائی حق (Divine Right) نہیں ہے بلکہ اقتدار عوام کی ملکیت ہے۔ 1762 میں فرانسیسی دانشور روسو نے معاہدہ عمرانی (Social Contract) لکھی اور یہ تصور مغرب نے مان

لیا کہ ریاست عمرانی معاہدہ ہے۔عوام نے اپنے اختیارات حکمرانوں کو منتقل کیئے ہیں تا کہ وہ امن وامان قائم کرسکیں۔

ہماری ساری سیاسی تعلیمات امیر کے اختیارات کے گرد گھومتی رہیں۔شوریٰ کو ہم نے امیر کے تابع کر دیا یہ کہہ کر کہ شوریٰ کو بھی اُمیر نامزد کرے گا۔ جب شوریٰ بھی نامزد اوراس کا فیصلہ بھی امیر کیلئے ماننالازم نہیں تو پھر حکمران صدام حسین نہیں بنیں گےتو اور کیا ہوگا۔

ہم ہی تو عوامی شورائیت کے علمبردار تھے۔اب ہم ہی اس کے خلاف ہو گئے۔ جمہوریت کی اصلاح کی بجائے اس کی مخالفت پر اپنی تمام توانیاں خرچ کرنے لگے۔ ہماری سیاسی حالت اب بھی فرانس کے انقلاب (1779ء) سے بھی پہلے کی ہے۔

## (iii) حقوق انسانی

معاہدہ عمرانی کے تصورات نے اخوت آزادی اور برابری کے اصولوں کو آگے بڑھایا۔ میگنا کارٹا(1215ء)میں یہ طے ہوگیا تھا کہ عوام کے اپنے حقوق ہیں۔مساوات،اخوت اور آزادی کے فرانسیسی تصوراتِ انقلاب نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

حقوقِ انسانی کی تحریک چلی۔عورتوں کو انسان سمجھا جانے گا۔بچوں کے الگ حقوق طے ہونے لگے۔احترامِ انسانیت کا وہ تصور جو آنجناب ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں دیا تھا وہ عملی طور پر راہنما اصول بن گیا۔سیاسی اور شخصی آزادیوں نے انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کو نکھرنے کا موقع دیا۔انسان اپنی مرضی کا مالک بن گیا۔قانون کی حکمرانی رواج پا گئی۔آزادی اظہار نے عوام کی رائے کو وزن بخش دیا۔جان و مال کی آبرو سے معاشرے میں امن وسلامتی رواج پانے لگی۔

حقوقِ انسانی کی تحریک نے عالمگریت اختیار کرلی۔ہم زمانہ وسطیٰ میں رہ گئے۔عوام کو شہری کے بجائے محکوم سمجھتے رہے۔قانون کا توڑنا عزت کی علامت بنالیا۔جان و مال حقیر شے سمجھتے رہے۔عورتوں کو انسان سمجھنے کی بجائے شے سمجھتے رہے۔

### (iv) نئے سماجی علوم

انسان نے دیگر معاملات میں بھی حرکت کی۔سائنسی وسیاسی ترقی نے نئے علوم جنم دیئے۔فلسفہ غزالی سے ہوتا ہوا کانٹ تک پہنچا۔عربوں کی تجربیت نے ھیوم (Hume) سے ہوتے ہوئے رسل تک کا سفر طے کیا۔منطق ارسطو سے چل کر عہدِ حاضر میں زندگی کا حصہ بن گئی۔پچھلی چارصدیوں میں شاعری،افسانہ،ڈرامہ،موسیقی نے کئی عروج دیکھے۔ہم امرائے القیس پڑھاتے رہے۔علم معاش نے ریکارڈو،آدم سمتھ (1776ء) اور کارل مارکس (1848ء) پیدا کئے جنہوں نے علم المعاش بدل دیا۔ہم آج تک کتاب الاموال اور کتاب الخراج (دوسری صدی ہجری کی کتب) پڑھاتے ہیں۔

### (v) عقلیت پسندی

سائنسی اور سماجی ترقی نے انسان کو اہمیت دی۔عقل کی اہمیت کو اجاگر کیا عقل کو معیار حقیقت بنایا۔عمومی رویوں کو غصے، جذبات اور توہمات سے آزاد کیا۔عقل سے عمومی حالات بہتر کرنے کی کوشش کی۔ایک علمی اور عقلی ماحول بنا۔ایک مزدور بھی اپنے گھر میں لائبریری بنانے لگا۔

ہم نے گہری نیند جاری رکھی۔ہمارا فرض بنتا تھا کہ قرآنی فکر کو آگے بڑھاتے کہ عقل کا استعمال لازم ہے۔تدبر و تفکر ایمان کا لازمہ ہے۔عقل کو چراغِ راہ بناتے۔ہم نے خالصتاً غیر عقلی رویّہ اختیار کیا۔عقل کو گالیاں دیں۔ایمان کو غیر ضروری طور پر عقل کے مقابل لاکھڑا کیا۔اپنے علماء کی عصری تعبیروں کو اسلام سمجھ لیا۔حالانکہ وہ اس زمانے میں اسلام کی تفہیم تھیں۔اسلام نہ تھیں۔تعبیر کو بھی ہم نے اصل متن سمجھ لیا۔

## (vi) معاشی ترقی

جمہوریت اور حقوق انسانی نے انسانی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ انسان کی تخلیقی صلاحیتیں انسان کی فلاح میں خرچ ہونے لگیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) کو جنم دیا۔ نقل وحمل (Communications) کی ترقی سے بین الاقوامی تجارت میں بڑھوتری (Grouth) ہوئی۔ انسان دوست قوانین اور بینکوں نے معاشی ترقی کو آگے بڑھایا۔ اور ہم دنیا کو مردار سمجھتے رہے۔

# پانچواں باب

# موجودہ حالت

اس خواب غفلت کا وہی انجام ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔اس لئے کہ فطرت اپنے اصول نہیں بدلتی۔اللہ عزوجل اس کائنات کو اپنے طے شدہ اصولوں (سنت) کے مطابق چلاتے ہیں۔

آیئے اس سوچ کے آئینے میں تھوڑی دیر کیلئے اپنا چہرہ دیکھ لیتے ہیں۔ہمارا اسلام اقراء (پڑھ) سے شروع ہوا تھا۔ہم نے دنیا میں علمی تحریک کو جنم دیا تھا۔مغرب کی نشاۃ ثانیہ ہم نے عطا کی۔

عہدِ نو با جلوہا آراستہ
از غبارِ پائے ما برخاستہ

(اس عہد کی چمک ودمک ہمارے پاؤں کے غبار سے ہی ہے)

(i) جہالت

آج ہم دنیا کی جاہل ترین ملت ہیں۔تعلیمی معیار اور خواندگی ہماری سب سے کم ہے۔ایک ملک کی یونیورسٹیاں (جاپان) پوری مسلمان ملت سے زیادہ ہیں۔ہارورڈ یونیورسٹی کا بجٹ بہت سے مسلمان ممالک کے کل تعلیمی بجٹ سے زیادہ ہے۔آکسفورڈ میں ایک سال میں پی ایچ ڈی کرنے والے 56 مسلمان ممالک میں پی ایچ ڈی کرنے والوں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ہم انسانی آبادی کا ایک چوتھائی ہیں لیکن ہمارے سائنس دان دنیا کے سائنسدانوں کا ایک فیصد بھی نہیں ہیں۔بلکہ امریکہ کے سائنسدانوں کا ایک فیصد بھی نہیں ہیں۔کیا یہ حالت ہمیں زیب دیتی ہے؟

2003ء میں چین کی شنگھائی یونیورسٹی نے علمی تدریس وتحقیق کے حوالے سے دنیا کی اعلیٰ یونیورسٹیوں کی درجہ بندی کی ہے جوکہ انٹرنیٹ پراس پتہ پرموجود ہے۔

http://ed.sjtu.edu.cn/rank/methodology.htm

اس تحقیق کے مطابق دنیا کی اعلیٰ ترین دس یونیورسٹیوں میں سے آٹھ امریکہ کی ہیں اوردو برطانیہ کی۔ دنیا کی سو اعلیٰ ترین یونیورسٹیوں میں پوزیشن درجہ ذیل ہے۔

| | |
|---|---|
| امریکہ | 57 |
| برطانیہ | 09 |
| جاپان، جرمنی | 05 |
| کینیڈا | 04 |
| ہالینڈ، سوویٹزرلینڈ، سویڈن | 03 |
| فرانس | 02 |
| آسٹریا، آسٹریلیا، بلجیم، ڈین مارک، فن لینڈ<br>اسرائیل، اٹلی، ناروے | 01 |

اگرہم دنیا کی پانچ سو اعلیٰ ترین یونیورسٹیاں دیکھیں تو پورے عالم اسلام کی صرف دو یونیورسٹیاں اس لسٹ میں شامل ہیں۔ اوروہ دونوں ترکی میں ہیں۔ Hacettepe کی یونیورسٹی 453 نمبر پر ہے۔ جب کہ استنبول کی یونیورسٹی 483 نمبر پر ہے۔ اس صورت حال سے آپ خوداندازہ لگالیں کہ دنیا کی آبادی کا ایک چوتھائی اور بے پناہ تیل کا مالک ہونے کے باوجود ہماری یونیورسٹیوں کا شمار دنیا کی پہلی چارسو پچاس یونیورسٹیوں میں بھی نہیں ہے۔

ہماری آبادی ایک ارب بیس کروڑ ہے۔ یہودیوں کی آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ ہے۔ آج تک ہم نے صرف چھ نوبل پرائز (Nobel Prize) حاصل کئے ہیں جبکہ یہودیوں نے ایک سوتریسٹھ (163) حاصل کئے ہیں یہودی ہماری آبادی کا ایک فی صد ہیں جبکہ ستائیس گنا پرائز حاصل کئے ہیں۔

(ii) غربت

ہماری معاشی حالت ناقابل بیان ہے۔ تمام مسلمان ممالک بشمول سعودی عرب (جہاں بے پناہ تیل ہے) کی سالانہ قومی آمدنی جاپان سے بھی کم ہے۔ وہ جاپان جس کی زمین نہیں جس میں تیل نہیں بلکہ صرف اور صرف ٹیکنالوجی ہے۔

ہماری اوسط عمر 50 سال ہے۔ جاپان میں 80 سال ہے۔ انہوں نے سائنس سے موت کو دھکیل دیا ہے۔ ہم سنت کے مطابق علاج کئے بغیر موت کو اللہ کی مرضی سمجھ لیتے ہیں۔

(iii) عسکری بے بسی

ہمیں حکم تھا کہ دشمن کیلئے پوری استطاعت سے تیاری کرو۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ہم دنیا کی کمزور ترین ملت ہیں۔ افغانستان کا حشر دیکھ لیں وہاں تو بہت سے مسلمانوں کے بقول اسلام کی خالص حکومت تھی۔ کیا حشر ہوا۔ جا کر تورابورہ کو دیکھیں۔ پہاڑ بھی فنا ہو گئے ہیں۔

عراق میں آپ کے کچھ مقدس ترین مقامات ہیں۔ سیّدنا علیؓ کا مزار ہے۔ سیّدنا حسینؓ کا مزار ہے۔ سیّدنا عبدالقادر جیلانی کا مزار ہے۔ سیّدنا ابوحنیفہ کا مزار ہے۔ وہ دیس اب امریکی بوٹوں کے نیچے ہے۔ عراق کی جنگ میں تمام مسلمان ممالک نے صرف زبانی مخالفت کی۔ او آئی سی (OIC) نے قراردادیں پاس کیں لیکن بے بسی دیکھیں کہ اپنی سرزمین امریکیوں کو دی کہ عراق پر حملے کیلئے استعمال کرلے۔

## (iv) سیاسی جبر

اپنا سیاسی نظام دیکھیں۔ کسی ایک مسلمان ملک میں بھی مکمل شورائی حکومت نہیں ہے۔ افغانستان میں ملا عمر کی اسلامی حکومت تھی۔ وہ عالم دین تھے۔ مکمل کنٹرول تھا۔ کوئی مشکل نہ تھی۔ اپنے حساب سے خالص اسلام نافذ کیا۔ اسلام کی صورت بگاڑنے کے علاوہ کیا کیا ہے؟ جس کی داڑھی ایک مٹھی سے چھوٹی ہوتی تھی اس کو کنٹینرز میں بند کر دیا جاتا تھا۔ (داڑھی کی پیمائش ٹھوڑی پر لالٹین کی چمنی (گلاس) سے کرتے تھے) اس لئے غالباً خدا نے مزار شریف کے قبضہ کے بعد ان کو کنٹینرز میں بند کروایا جہاں وہ پیاس سے فوت ہو گئے۔

طالبان کو شوق ہوا کہ بدھ مت کے ہزاروں سال سے موجود مذہبی آثار ختم کریں۔ پوری دنیا نے شور وواویلا کیا کسی کی ایک نہ سنی یہ تک نہ سوچا کہ افغانستان حضرت عثمانؓ کے زمانے میں فتح ہوا ہے۔ حضرت عثمانؓ خانہ کعبہ کے بت گرانے والوں میں شامل تھے۔ انہوں نے بدھ مت کے ان آثار کو نہیں گرایا۔ حضرت علیؓ و حضرت حسنؓ نے نہیں گرایا۔ محمود غزنوی جسے ہم بت شکن کہتے ہیں وہ ان بتوں کے پہلو میں پیدا ہوا۔ وہ ہزاروں میل دور سومنات میں جا کر بت توڑتا رہا لیکن اپنے قرب وجوار میں ان بتوں کو برداشت کرتا رہا۔

طالبان کے اسلام میں عقل نہ تھی۔ تاریخ کا احساس نہ تھا۔ اقلیتوں کے حقوق نہ تھے۔ انہیں آقائے نامدار کی سیرت کا اندازہ نہ تھا۔ ان کا اسلام کھنڈروں اور غاروں کے زمانے کا اسلام تھا۔ اسی لئے تورابورا کے غاروں میں دفن ہو گیا۔ لیکن امت مسلمہ پر قیامت برپا کر گیا۔

ہمارے ہاں اتنے سیاسی جبر اور بے عقلی کے باوجود عوامی حاکمیت کیلئے مناسب علمی یا سیاسی تحریکیں نہیں ہیں۔ تبدیلی کی خواہشمند جماعتیں بھی شخصی، خاندانی یا فرقہ پرست ہیں۔ جن کے سیاسی نظریات ملوکیت والے ہیں۔

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؑ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

### (v) دین کی غلط تعبیر

مسلمان ذاتوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہر فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ اصل دین اس کے پاس ہے اور باقی سب کافر ہیں۔ حتیٰ کہ دوسرے فرقوں کے خلاف قتل و غارت کو بھی ثواب سمجھا جاتا ہے، جہاد سمجھا جاتا ہے۔

جہاد جو اصلاح نفس اور اصلاح معاشرہ کا ایک خوبصورت ذریعہ تھا وہ قتل و غارت کا آلہ کار بن گیا۔ 1998 کے رمضان شریف کی ایک صبح آج بھی مجھے پوری طرح یاد ہے۔ میں سحری کر کے لیٹا ہی تھا کہ مجھے پولیس وائرلیس نے پیغام دیا کہ تھانہ قریشی (مظفر گڑھ) کی ایک مسجد پر فائرنگ ہوئی ہے۔ کچھ لوگ مارے گئے ہیں۔ میں اور ایس پی صاحب منہ اندھیرے مسجد میں پہنچے۔ لوگ بہت مشتعل تھے۔ بہت مشکل سے مسجد میں داخل ہوئے۔ ایک چھوٹی سی مسجد میں کچھ لوگ صبح کی نماز کے بعد قرآن مجید پڑھ رہے تھے۔ کچھ ظالم لوگ آئے۔ جذبہ جہاد سے سرشار تھے۔ انہوں نے گولیاں چلائیں۔ سترہ لاشیں چھوڑ گئے۔ میں نے دیکھا کہ مسجد کا کمرہ لاشوں سے بھرا پڑا ہے۔ مسجد میں خون ہی خون ہے۔ قرآن مجید گولیوں سے چھلنی ہیں۔ وہ نیک لوگ تھے۔ سحری کے بعد مسجد میں تھے۔ قرآن پڑھ رہے تھے۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ ان کا تعلق ایک خاص فقہی مسلک سے تھا۔

یہ کیوں ہوا؟ مجھے یہ بات کہنے میں کوئی شرم نہیں کہ اسلام سے غافل علماء کی شعلہ بیانیوں سے ہوا۔ میں نے ملازمت کے دوران بارہا علماء کرام سے دوسرے فرقے کے لوگوں کو قتل کرنے کے فضائل سنے ہیں۔ گھنٹوں میں نے علماء سے بحث کی۔ ان کو سمجھایا کہ نہیں سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے لیکن مجال کہ وہ میری گزارشات سنتے۔ بس ان کے منہ پر ایک ہی لفظ ہوتا کہ وہ

کافر ہیں۔ جہاد کی غلط تعبیر سے مذہبی فرقہ واریت بڑھ گئی ہے۔ جوانوں کا خون بہہ رہا ہے اور عالمی سطح پر اسلام کا امیج (Image) خراب ہوگیا ہے۔

معاشی معاملات میں بھی ہماری سوچ صحیح نہیں ہے۔ ہماری معاشی فکر پر جاگیرداری اورسرمایہ داری کا غلبہ ہے۔ جنرل ایوب خان اور ذوالفقارعلی بھٹو نے پاکستان میں زرعی اصلاحات(Land Reforms) نافذ کیں جس میں یہ طے کیا گیا کہ کوئی بھی آدمی ایک خاص حد سے زیادہ زمین اپنے پاس نہیں رکھ سکتا اورحکومت اس حد سے زیادہ زمین اس شخص سے لیکر اُن لوگوں کے حوالے کردے گی جو اس وقت اس زمین کو کاشت کررہے ہوں گے۔ سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بینچ نے ان اصلاحات کو قزلباش وقف کیس میں غیر اسلامی قرار دے دیا۔

(PLD 1990 SC 99)

صرف فرقہ پرستی ہی نہیں بلکہ جہالت، غربت، سیاسی جبر اور عسکری بےبسی بھی دین کی غلط تعبیر کا نتیجہ ہیں۔ ہم نے اسلام کو توہم پرستی اور دنیا سے بیزاری کا مذہب بنا دیا ہے حالانکہ اسلام ایک ترقی یافتہ اور سائنسی دین ہے جو ایک شاندار تہذیب بناتا ہے۔ ہمارا اسلام مسکنت کا مذہب بن گیا ہے۔ موجودہ تعبیر کا فطری نتیجہ وہ ذلت ہے جسمیں ہم اپنی زندگی بسر کررہے ہیں۔ اگر جہالت، غربت، عسکری بےبسی، سیاسی جبر اور فرقہ واریت جاری رہے گی تو ذلت مقدر رہے گی۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے<br>
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

# چھٹا باب

# لائحہ عمل

ہم دنیا کی جاہل ترین قوموں میں سے ایک ہیں۔ سیاسی نظام ابھی تک ملوکیت والا ہے۔ عسکری لحاظ سے مغلوب ہیں۔ معاشی لحاظ سے مفلوک ہیں۔ سماجی لحاظ سے پست ہیں۔ انسانیت کا احترام نہیں۔ قانون کی پرواہ نہیں۔ فرقہ بندی ہے اور کہیں ذاتیں ہیں۔ ہماری حالت کا بیان اس شعر سے بہتر نہیں ہوسکتا۔

اک چاک ہو تو سی لوں یارب
ظالم نے پھاڑ ڈالا ہے تار تار کر کے

جب ہم نے اپنی حالت صحیح کرنے کی کوشش کرنی ہے تو ہمیں دیکھنا ہے کہ مسئلہ کیا ہے اور کہاں کہاں بہتری ہوسکتی ہے؟ اس لئے چند پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ اسے اسلام دشمنی نہ سمجھیے گا بلکہ عاجزانہ گزارشات گردانیے گا۔

### (i) اصل تعلیمات کی دعوت

**صحیح نظریہ:** اسلام ایک واضح و الگ فکری نظام رکھتا ہے جس کی روشنی میں زندگی کی ایک خاص نہج بنتی ہے اسلام کے مطابق یہ کائنات بے معنی نہیں ہے۔ باطل نہیں ہے بلکہ اپنے اندر گہرے معنی رکھتی ہے۔ اس کی ایک ابتداء ہے اور ایک واضح انتہا ہے۔ اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ اور اس کا ایک بادشاہ ہے۔ اور کائنات اس کے تابع ہے انسان اس نظام کائنات کا دلہا ہے۔ اللہ کا ولی عہد ہے۔ جس طرح نظامِ کائنات ایک ضابطہ کے تحت چل رہا ہے ویسے ہی انسان کیلئے ایک ضابطہ حیات ہے۔ ہدایت ہے۔ اگر وہ اس پر چلے گا تو ہدایت پائے گا نہ اسے کوئی مستقبل کا خوف ہوگا اور نہ ہی اپنے ماضی کا غم (البقرہ۔38)

اس بنیادی خاکہ (Paradigm) کے اندر انسان اپنی صلاحیتوں کو تخلیقی عمل دے سکتا ہے بلکہ ایسا کرنا لازم ہے۔ یہ زندگی ایک نئی شکل لے گی اور پھر انسان کی جواب دہی ہوگی۔ اگر زندگی میں انسان نے ہدایت پر عمل کیا تو دنیا وآخرت میں فلاح پائے گا اور اگر یہاں ہدایت سے بے نیازی برتی اور اپنے خالق سے بغاوت کی تو پھر ذلت اس کا مقدر ہوگی۔ یہاں مادی ترقی عام طور پر محنت سے ملتی ہے۔ بلکہ اسباب دنیا کی کثرت عزت کی علامت نہیں ہے۔ انسان آزمائش میں ہے۔ حیات وموت کی تخلیق آزمائش ہے کہ انسان کیسے اعمال کرتا ہے (الملک ۔2)

یہ وہ نظریہ حیات ہے جو اسلام پیش کرتا ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت اس سے غافل ہے۔ ہم کئی طبقات میں تقسیم ہیں۔ کچھ لوگ اس حیات وکائنات کو بے مقصد سمجھتے ہیں۔ اپنی ذاتی واجتماعی زندگی میں خدا کے دخل کو نہیں مانتے۔ اپنی عقل سے اوپر کوئی ہدایت نہیں سمجھتے اپنے آپ کو کسی کے سامنے جوابدہ نہیں سمجھتے عام طور پر ہمارے صاحبِ دولت اور صاحبِ اقتدار لوگ اس فکر میں گم ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ زندگی ایک بار ملی ہے۔ عیش کرنا چاہیے۔ اعلیٰ اخلاق ان کا مسئلہ نہیں ہے۔

ہم میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کئی خداؤں پر یقین رکھتے ہیں۔ جائیداد بھی خدا ہے۔ اقتدار بھی خدا ہے۔ پیر بھی خدا ہے۔ عجیب رسوم ورواج اپنائے جاتے ہیں۔ نہ کوئی واضح ہدایت ہے نہ کوئی واضح عمل، کئی خدا اور کئی اخلاق۔ اکثر غریب لوگ اس فکر کے زیر اثر ہیں۔

تیسرا گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو اس دنیا کو عذاب سمجھتا ہے۔ روح کو قیدی سمجھتا ہے۔ انسانی خواہشات کو گناہ سمجھتا ہے۔ ریاضت کے نام پر اپنے جسم کو تکلیف دیتا ہے۔ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے۔ دنیا کو ترک کر کے الگ بیٹھ جاتا ہے۔ غلط قسم کی قسمت پرستی میں مبتلا

ہے۔دین ودنیامیں تقسیم کی جاتی ہے۔ایمان بچانے کیلئے دنیاوی معاملات ترک کردیئے جاتے ہیں۔دین کی انقلابی تعلیمات کی بجائے کشف وکرامات میں مست رہتے ہیں۔عام مذہبی لوگ اس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہمارالائحہ عمل یہ ہوناچاہیے کہ ہم دین کی صحیح تفہیم کریں۔نظریہ حیات واضح کریں۔ازسرِنوغورکریں کہ دین ہم سے کیاتقاضا کرتا ہے۔اس کائنات میں ہماری پوزیشن کیاہے۔ہمارے اعمال کا کیامقام ہے ہمارااخلاق کیسا ہوناچاہیے؟اسلامی فکرکوجس کا پہلے ذکر کیاگیاہے،اپنے اندر جذب کریں اورفکری لحاظ سے باشعوراورعملی لحاظ سے ذمہ دارفردبنیں۔اپنی ذاتی صلاحتیوں کو بھرپورطریقے سے استعمال کرتے ہوئے اجتماعی فلاح کیلئے صرف کریں۔انسانی خدمت میں اللہ کی رضاڈھونڈیں۔جلوت میں خلوت پائیں۔

**بنیادی تعلیمات:** اہل اسلام کی تمام گفتگو کا مرکز غیرضروری علمی وقانونی موشگافیاں ہیں۔آپ تمام مکتبِ فکر کے سوعلماء کی ایک سوگھنٹہ تقاریریا مجالس سنیں۔ان میں آپ کو یہ موضوعات ملیں گے کہ نبی اکرمﷺ کوعلم الغیب تھا کہ نہیں تھا؟ کیانبی اکرم حاضروناظر ہیں؟ کیامردے قبر میں سنتے ہیں؟ کیااللہ والے مشکل کشائی کرسکتے ہیں کیاگیارھویں شریف شرک ہے؟ کیا آمین بالجہر کہنا صحیح ہے؟ نمازمیں ہاتھ کہاں باندھنے چاہیں؟ نمازمیں سرڈھانپنا چاہیے کہ نہیں؟ نمازمیں ٹخنے ننگے ہونے چاہیں کہ نہیں؟ کون سی شخصیت افضل ہے؟ کونسا فقہ افضل ہے؟ کیاوہ فرقہ کافر ہے؟ کیاوہ مشرک ہے؟ ان سوگھنٹوں میں نوے گھنٹے آپ کو یہ مضمون ملیں گے باقی دس گھنٹے شاید آپ کواسلام کی حقیقی تعلیمات پرگفتگو سننے کومل سکے۔

اس تجزیئے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم اصل محور سے ہٹ گئے ہیں۔اصل موضوع سے دور ہیں ہماری تمام کی تمام توانائیاں غیرضروری کلامی و فقیہانہ مباحث میں ضائع ہورہی ہیں۔ہماری تمام گفتگو ایک دوسرے کے خلاف ہے۔اصلاح کی بجائے فساد پھیلا رہی ہے ہم اپنے عوام کو توحید کی روح نہیں سمجھا رہے سیرتِ مصطفیٰ کی روشنی سے منور نہیں کرر ہے عبادات کی روح سے روشناس نہیں کرار ہے۔اخلاق کے زیور عطا نہیں کرر ہے خلوص اور سخاوت نہیں بتار ہے۔پھر بھی سمجھ رہے ہیں کہ ہم دین کی خدمت کرر ہے ہیں دین کے علمبردار ہیں اور دین دنیا میں غالب آنے والا ہے۔ایسی ہی صورتِ حال کے بارے میں قرآن نے کہا ہے کہ

'کیا میں آپ کو ان لوگوں کے بارے میں نہ بتاؤں جن کے اعمال
سب سے زیادہ خسارہ والے ہیں۔وہ کام تو غلط کرتے ہیں لیکن
سمجھتے ہیں کہ صحیح کرر ہے ہیں''۔(سورۃ کہف آیت 103)

قرآن کریم نے اس آیت میں ایک نفسیاتی بیماری کا ذکر کیا ہے جس کو جدید علم نفسیات میں واہمہ (Delusion) کہتے ہیں ہم سب انفرادی اور اجتماعی طور پر اس واھمہ کا شکار ہیں ہمیں چاہیے کہ اپنی دینی گفتگو میں دین کی مبادیات کی بات کریں۔فرقہ واریت،مردم بیزاری اور انسان دشمنی ترک کردیں۔اپنی گفتگو میں نرمی و محبت پیدا کریں۔

فقیہہ شہر کی باتوں سے نالاں
خدا و محمدؐ و محراب و منبر

جو ایک دفعہ آپ کے پاس آجائے اپنا دل ہار بیٹھے۔آپ کی محبت اس کے دکھ درد کا مداوا بن جائے۔اس کی زندگی میں ایمان کی بہار آجائے۔جو آپ تک نہیں پہنچا یا جس تک آپ نہیں پہنچے اس کی فکر میں آپ کی نیند بے مزہ رہنی چاہیے۔آپ اپنے آپ کو لوگوں کے ایمان و اخلاق کیلئے گھولتے رہیں کوئی سنے یا نہ سنے صدادیتے رہیں۔نالے بلند کرتے رہیں پھر جلد

افلاک سے نالوں کا جواب آئے گا۔ حجاب اٹھیں گے اور خطاب ہوگا۔ تب اللہ کی زمین پر جنت بنے گی۔

**عقلی رویے:** ہمارا رویّہ غیر عقلی اور غیر متناسب ہے۔ قرآن تو ہر لمحے تفکر کی دعوت دیتا ہے مگر ہم خالص جذباتی انداز میں سوچتے ہیں۔ پہلے زمانے کے علماء نے بہت محنت سے دین کے احکامات واعمال کی درجہ بندی کی۔ اگر چہ اس سے معاملات وعبادات میں سختی پیدا تو ہوئی لیکن یہ بھی طے کرنا آسان ہوگیا کہ کس چیز کی کتنی اہمیت ہے۔ مثال کے طور پر عبادات کو دیکھیں۔ یہ طے کر دیا گیا کہ کیا فرض ہے۔ کیا واجب ہے کیا سنت ہے کیا مستحب ہے کیا فرض کفایہ ہے؟ اس درجہ بندی کا فطری اور لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو چیز فرض ہے وہ واجب سے زیادہ اہم ہے جو واجب ہے وہ سنت سے زیادہ اہم ہے۔ جو سنت ہے وہ نفل سے زیادہ اہم ہے۔ لیکن ہم اس مقصد کو بھول گئے اور پورا زور درجہ بندی کی بحث میں لگا دیا۔ اور اس درجہ بندی کا فرق بھول گئے۔

نماز کی مثال لے لیں۔ نماز میں کیا اصل ہے؟ خاص طرح کا انداز یا اللہ کی طرف دھیان؟ نماز کیلئے ٹوپی، ٹخنوں کا ننگا ہونا اور آمین کا آہستہ یا اونچا کہنا زیادہ سے زیادہ سنت سے متعلق مسائل تھے۔ لیکن اصل بات تو یہ تھی کہ کیا نماز میں احسان حاصل ہے کہ نہیں۔ کیا نماز میں دکان یاد آتی ہے یا کبھی کبھار خدا بھی یاد آجاتا ہے۔ نماز میں کیا اللہ عزوجل ہمیں دیکھتے ہیں۔ یا ہم انہیں دیکھتے ہیں۔ ہماری صورت حال یہ ہے کہ ایک دوست نے کہا کہ بہت سی بھولی بسری چیزیں مجھے نماز کی نیت باندھتے ہی یاد آنے لگتی ہیں۔ حضرت اقبال نے کیا خوبصورت کہا ہے۔

میں جو سربسجدہ کبھی ہوا تو زمیں سے آنے لگی یہ صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

میں نے نماز پر سینکڑوں تقاریر سنی ہیں۔ موضوع عام طور پر نماز کے فقیہانہ مسائل ہوتا ہے۔ شاذ و نادر یہ موضوع سننے کو ملتا ہے کہ نمازؐ اصل میں اللہ عزوجل سے ملاقات کا بہانہ ہے۔ یہ معراج ہے۔ یہ تہذیبی عمل ہے۔ انصاف، برابری اور اخوت سکھاتی ہے۔

آپ خود مطالعہ کرلیں، ایک سو مساجد میں لٹکے ہوئے نماز سے متعلق اشتہارات اور پوسٹروں کا تجزیہ کریں۔ آپ کو 99 فیصد قانونی پہلوؤں پر بحث ملے گی۔ کیا چھوٹی داڑھی والا امام ہوسکتا ہے؟ کیا پتلون میں نماز جائز ہے۔ کیا ٹی وی دیکھنے والا امام بن سکتا ہے؟ نماز میں دھیان کیسے پیدا ہو اپنے رحیم مالک کے جناب حضوری کیسے ہو؟ یہ معاملات نظر نہیں آئیں گے۔

میں ایک اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتا ہوں۔ میں ولایت میں زیر تعلیم (1997ء) تھا۔ لندن کے جنوب مشرقی علاقے کینٹ میں رہنے والے میرے ایک دوست نے ہماری دعوت کی۔ جس میں اندازاً بیس کے قریب مسلمان طالب علم اور ایک ہندو طالب علم رات کے کھانے پر مدعو تھے۔ میزبان اور اس کے اہل خانہ کھانا پکا رہے تھے۔ ولایت کی روایت کے مطابق ہم سب ان کی مدد میں لگ گئے۔ تھوڑی دیر بعد نماز مغرب کا وقت ہوگیا۔ ولایت کے رہنے والے تقریباً اٹھارہ نوجوان (جنھوں نے جینز کی پتلونیں پہنیں تھیں۔ ایک کے علاوہ جن کی داڑھیاں بھی نہ تھیں) وضو میں تھے۔ اصرار کرنے لگے کہ میں نماز پڑھاؤں میں نے ولایت میں رہنے والے 22 سالہ نوجوان کو زبردستی آگے کر دیا جس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تو تھی۔ مگر جینز کی پتلون تھی۔ بڑے بڑے فوجی بوٹ پہن رکھے تھے۔ اس نے بوٹوں سمیت نماز پڑھائی میں نے اتنی پُر اثر نماز کبھی نہیں دیکھی۔ میں نے بہت سے غزالیِ زمان اور رازیِ دوران دیکھے ہیں۔ پیر

طریقت دیکھے ہیں مگر ولایت میں رہنے والے اس چھوٹی داڑھی والے بوٹوں سمیت نماز پڑھانے والے کی شان ہی کچھ اور تھی۔حرمین کے علاوہ میں نے نماز میں اور امامت میں اتنی حلاوت کبھی نہیں دیکھی۔

میری منشاء کسی پر تنقید نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اصل شے روح بلالی ہے۔جس کی طرف ہماری توجہ ہی نہیں جاتی۔ظاہر و باطن کا تناسب ہم نے کھو دیا ہے۔میرا عقیدہ ہے کہ ظاہر بھی لازم ہے۔اس لئے کہ ظاہر کے بغیر باطن بیکار ہے۔مگر ظاہر کا مقابلہ روح سے ہو گا تو روح کو ترجیح دینا ہوگی۔

ایک اور مثال لیں غیبت اسلام میں سخت ناپسندیدہ ہے اپنے بھائی کا گوشت کھانے کے برابر ہے۔سگریٹ پینا اکثر علماء کے نزدیک صرف مکروہ ہے لیکن ہماری دینی سوچ عجیب ہے غیبت کرنیوالے کو کچھ نہیں کہتے مگر سگریٹ پینے والا بہت برا سمجھا جاتا ہے حالانکہ اس میں کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی کہ غیبت بدتر شے ہے۔

میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم نے اسلامی توازن کھو دیا ہے۔مختلف اشیاء کے درمیان توازن کھو دیا ہے۔اہم کو غیر اہم اور غیر اہم کو اہم سمجھنے لگ گئے ہیں۔نفل کو فرض سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔مکروہ کو حرام سے زیادہ برا سمجھتے ہیں۔چالیسواں جمعہ کی نماز سے زیادہ اہم ہے وغیرہ وغیرہ۔اس غیر متوازن فکر نے ہماری پوری زندگی کو ٹیڑھا کر دیا ہے۔سماجی ومعاشی زندگی بے ہنگم ہوگئی ہے ہستی کیا ہے؟ ترتیب کا نام ہے۔توازن کا نام ہے۔اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے، انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

ان حالات میں ہمارے لئے لازم ہے۔کہ ٹھنڈے دل سے سوچیں اور اضطرابی طرزفکر چھوڑ دیں۔اضطراب میں چھوٹی شے بڑی نظر آتی ہے۔اور بڑی شے چھوٹی نظر آتی ہے۔ہم بھی فکری اضطراب کا شکار ہیں جس کے سبب فکری توازن سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔اس کو بدلنا ہوگا وگرنہ تہذیبی کجی برقرار رہے گی۔

### (ii) دین ودنیا کی تفریق کا خاتمہ

ہمیں دین ودنیا کی تفریق کو مٹانا پڑے گا۔جب میں کبھی اعلیٰ تعلیم اچھی ملازمت، اچھے گھر کی بات کرتا تھا تو میرے ایک انتہائی قریبی اور مذہبی دوست مجھے 'دنیا کا کتا' کہتے تھے۔پہلے تو میں اسے محبت کی ایک رسم سمجھتا رہا بعد میں میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے مجھے ایک حدیث سنائی کہ دنیا مردار ہے اور اس کے چاہنے والے کتے ہیں۔میں نے انہیں عرض کیا کہ اوّل تو یہ حدیث نہیں لگتی۔اگر ہے بھی تو اس کا مفہوم یہ نہیں جو آپ بیان کرر ہے ہیں۔لیکن آپ سوچیں کہ ایک دنیاوی ترقی کے خواہش مند طالب علم کو جب آپ اس طرح برا بھلا کہیں گے تو کیا وہ اعلیٰ سائنسدان بننے کی خواہش کرے گا۔اعلیٰ تعلیم،اعلیٰ کاروبار،اعلیٰ سواری اسے مردار لگیں گی اور وہ دنیا کا کتا نہیں بننا چاہے گا۔اس کا روّیہ دنیا کے خلاف ہو جائے گا۔

دین و دنیا کی تفریق کا تصور مطلقاً غیر اسلامی ہے۔یورپی نومسلم عالم جناب محمد اسد (Leopold Weis) نے دنیا کے بارے میں مسلمانوں کے معتدل نقطۂ نظر کو یوں بیان کیا ہے۔

> اسلام عیسائیت کی طرح دنیا کے متعلق بری رائے نہیں رکھتا۔اسلام چاہتا ہے کہ ہم دنیاوی زندگی کی قدر و قیمت میں موجودہ مغربی تہذیب کی طرح مبالغہ نہ کریں۔عیسائیت دنیاوی زندگی کی مذمت کرتی ہے۔اور اس سے نفرت رکھتی

ہے۔موجودہ یورپ عیسائیت کی اصل روح کے خلاف ابوالہوس کی طرح زندگی پر گرتا ہے۔زندگی کو نگلتا ہے مگر اس کی عزت نہیں کرتا۔اسلام عیسائیت اور مغرب کے برعکس اس کوسکون اوراحترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔اسلام زندگی کی پرستش نہیں کرتالیکن اسے بلندتر زندگی کے سفرکیلیئے لازم تصور کرتا ہے۔مگراس سے گزر جاتا ہے۔اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اے اللہ ہم کو دنیا میں بھی بھلائی عطا فرمااورآخرت میں بھی۔یہ اس دنیااوراس کی نعمتیں ہماری روحانی جدوجہد کے راستہ میں رکاوٹ نہیں۔مادی ترقی نہ توہمارامقصد ہےاورنہ ہی قابلِ نفرت۔

(Asad, Page 26)

اسلام دین وحدت ہے۔توحید ایک مجردتصورنہیں ہے بلکہ عملی نظریہ ہے۔توحید ایک نظریہ حیات ہے۔یہ ہرچیز میں وحدت کا قائل ہے۔دنیاودین کی وحدت،دنیا وآخرت کی وحدت،علم وعمل کی وحدت،روح وجسم کی وحدت،قبائل وعلاقوں میں وحدت،مذہب وعلم میں وحدت،امارت وغربت میں وحدت،اسلام کے نزدیک خداایک ہے۔علم ایک ہے،دنیا ایک ہے،انسان ایک ہے،انسانی عمل ایک ہے،موت وحیات ایک ہے،دنیااوردین ایک ہیں(اچھی طرح سے دنیا میں رہنے کا نام دین ہے۔دین پرعمل کرنے سے دنیااچھی ہوگی)جدیدوقدیم علم کی بحث کم نظری ہے۔عزرائیل صرف ہمارے جسم کوچھوتا ہے۔موت سے فنانہیں آتی بلکہ زندگی شکل بدل لیتی ہے۔

قرآن کریم نے حکم دیاہے کہ جب تم جمعہ کی نماز پڑھ لوتو زمین پرپھیل جاؤ اوراللہ کا فضل (رزق) تلاش کرو۔قرآن نے رزق کی تلاش کواللہ کافضل کہاہے۔یہ یہود کاعمل تھا کہ یومِ سبت (ہفتہ کے روز) صرف عبادت کرنا ہے۔دنیا کے دھندے میں نہیں پڑنا۔اسلام میں

جمعہ کی نماز کی عبادت سے فارغ ہوکر رزق کی تلاش کی عبادت میں شامل ہونے کا حکم ہے۔ مسجد میں بیٹھ کر خاموشی سے ذکر کرنے کا حکم نہیں ہے۔ ہم نے دین کا تصور دنیا چھوڑ کر خالص رہبانی تصور دین اختیار کرلیا ہے۔ کہ دین الگ ہے اور دنیا الگ ہے۔ ہم نے دنیا میں رہنا ہے۔ اس کو مسخر کرنا ہے۔

آیئے میں آپ کو چند مثالیں دوں۔ سیّدنا عبدالرحمٰن بن عوف عشرہ مبشرہ دس سب سے بڑے صحابہ کرام میں شامل تھے۔ ان کی وفات پر سونا کلہاڑوں سے کاٹ کر تقسیم کیا گیا۔ سیّدنا عثمانؓ کی دنیاوی دولت ان کی مذہبیت کو جلا بخشتی رہی۔ حضرت امام ابوحنیفہ کپڑے کے بہت بڑے تاجر تھے۔ بلکہ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ ہماری تاریخ کا کوئی بھی عالم اور سائنسدان ایسا نہیں تھا جو دنیاوی کاروبار میں مشغول نہ تھا۔

دین و دنیا کی تفریق تو آنجناب نے اس وقت مٹادی جب اللہ پاک کی طرف سے سکھائی جانے والی یہ دعا ہمیں ارشاد فرمائی

'اے ہمارے رب ہمیں دنیا کی بھلائیاں عطا فرما اور ہمیں آخرت کی بھلائیاں عطا فرما' (القرآن)

دین و دنیا کے باہمی رشتہ کے متعلق دو مثالیں دینا چاہتا ہوں۔ اعلیٰ گھر، اعلیٰ سواری، اعلیٰ کاروبار، سونا چاندی دنیا نہیں ہے بلکہ دنیا اللہ سے غافل ہونے کا نام ہے۔ اس کا سادہ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک آدمی رات کو تہجد پڑھ رہا ہے اور اس کے دل میں دنیا کی اشیاء کی ہوس ہے تو وہ خدا سے غافل ہے لیکن اگر کوئی آدمی ایک ارب روپے کے گھر میں ہے۔ ایک کروڑ روپے کی گاڑی میں ہے اور اس کا دل اللہ کی طرف مائل ہے تو وہ دین دار ہے۔ میں نے ایسے دنیادار دیکھے ہیں جو مکمل طور پر خدا مست ہیں۔ اور ایسے دین دار بھی دیکھے ہین جو مکمل طور پر دنیا کے طالب ہیں اور باوجود دعویٰ کے خدا سے مکمل غافل ہیں۔

دوسری مثال یہ ہے کہ اگر کشتی پانی میں رہے تو ٹھیک ہے بلکہ کشتی کے وجود کیلئے پانی لازم ہے۔لیکن اگر کشتی کے اندر پانی چلا جائے تو کشتی ڈوب جاتی ہے۔اگر ہم کشتی کی طرح دنیا پر تیرتے رہیں تو بہت اچھا ہے لیکن اگر دنیا ہمارے دین کی کشتی میں داخل ہو جائے تو پھر تباہی ہے۔

ہمیں دین و دنیا کی دوئی کی تعلیم نہیں دینا چاہیے۔اس تعلیم سے اچھی سوچ والا طبقہ اپنا ایمان بچانے کیلئے دنیا کے کاروبار سے الگ ہو جاتا ہے یا بددلی سے کام کرتا ہے اور دنیا صحیح معنوں میں دنیا کے کتوں کے حوالے ہو جاتی ہے جس سے دین داروں کو اور زیادہ نقصان ہوتا ہے بلکہ بعض حالات میں مذہبی طبقہ اپنی مذہبی رسومات تک کیلئے اہل دنیا کا محتاج ہو جاتا ہے۔ہمیں چاہیے کہ اپنی فکر صحیح کریں جب تک یہ فکر صحیح نہیں ہوگی، ہم ترقی نہیں کر سکتے۔

کبھی کبھی مجھے ہنسی آتی ہے کہ ایک طرف ہم اپنے ماضی میں اپنی دنیاوی شان وشوکت کا بہت فخر سے اعلان کرتے ہیں اور دوسری طرف دنیا چھوڑنے کا مشورہ دیتے ہیں۔دنیا چھوڑنا خالصتاً رہبانی فعل ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔اگر آپ دنیا کو فتح نہیں کریں گے اور اسے حاصل نہیں کریں گے تو دنیا کا رعب آپ کے دلوں کی پہنائیوں میں سما جائے گا۔آپ مانیں یا نہ مانیں آپ کا عمل اس کا شاہد ہوگا کہ آپ دنیا کے بندے ہیں اور دین کا صرف دکھاوا ہے۔یہ بہت بنیادی بات ہے۔اس پر توجہ نہایت ضروری ہے اس کے بغیر آپ عہد حاضر کی دوڑ سے خارج ہو چکے ہیں۔اگر اپنی اصلاح نہ کی تو تاریخ کا قصہ پارینہ بن جائیں گے اور آپ کا ذکر صرف کہانیوں میں رہ جائے گا۔

### (iii) شورائی نظامِ حکومت

سیاسی نظام کی اصلاح بہت اہم ہے۔نظام کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک ہم اپنی سیاسی فکر نہیں بدلیں گے۔اموی دور کے علماء سے لیکر عہد حاضر تک ہماری کتابوں میں یہ بحث ملتی ہے کہ امیر اہم ہے یا شوریٰ۔شوریٰ عوام کی نمائندہ ہوگی یا بادشاہ سلامت کی منتخب کردہ۔

ہماری عمومی سیاسی فکر یہ سمجھتی ہے کہ شوریٰ کے مقابلے میں امیر زیادہ اہم ہے۔شوریٰ صرف مشورہ دے سکتی ہے۔امیر پر اس کا مشورہ ماننا لازم نہیں ہے۔اور بادشاہ کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی شوریٰ بنائے۔آپ ذرا ایک لحظہ کیلئے غور کریں کہ یہ خالص ملوکیت وآمریت نہیں ہے تو اور کیا ہے کہ ایک بار کوئی مہم جو امیر بن جائے تو پھر اپنی مرضی سے اپنی شوریٰ بنالے اور کبھی کبھار شوریٰ سے مشورہ کرلے لیکن فیصلہ اپنی صوابدید پر کرلے اور پھر یہ کہے کہ اسے اللہ نے حاکم بنایا ہے۔اس وقت تک حاکم ہے جب تک اللہ چاہے گا اس لئے کہ اللہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے۔اللہ جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے اور امیر پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔اللہ امیر کی راہنمائی کرتا ہے۔امیر زمین میں اللہ کا سایہ ہے۔جو اس کی اطاعت کرے گا وہ اللہ کی اطاعت کرے گا۔جو بادشاہ کی توہین کرے گا وہ اللہ کی توہین کرے گا۔یہ وہ مسخ شدہ تعبیر ہے جو ہمارے بادشاہوں نے اپنے اقتدار کے حصول اور اسے دائمی رکھنے کیلئے پیش کی ہے۔میری دیانتدارانہ رائے میں اس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

عہد حاضر میں اگر چہ عمومی فکر تو یہی ہے لیکن کچھ علماء اور دینی جماعتوں نے اس فکر کو چیلنج کرنا شروع کر دیا ہے۔میں صرف چند مثالوں پر اکتفاء کروں گا۔1947ء میں جب اسلام کے نام پر پاکستان وجود میں آیا تو یہ بحث شروع ہوگئی کہ اسلام کا سیاسی نظام کیا ہوگا۔اس پس منظر

میں 1949ء میں دستور ساز اسمبلی میں قراردادِ مقاصد منظور کی گئی۔اس قرارداد کو پاکستان کے تقریباً تمام علماء کی حمایت حاصل تھی اور آج تک تمام مذہبی طبقہ اس کو قبول کرتا ہے۔اس قرارداد نے اقتدار کا صحیح اسلامی تصور پیش کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات پر اصل حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے۔اس نے اپنا اختیار پاکستان کی ریاست کو تفویض کیا ہے جسے پاکستان کے عوام استعمال کریں گے اور یہ اقتدار ایک مقدس امانت ہے۔ریاست یہ اختیار عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی۔اس نظام میں جمہوریت، آزادی، برابری، رواداری اور سماجی انصاف ہوگا۔ جہاں اقلیتوں کے حقوق کا مکمل تحفظ ہوگا۔ بنیادی انسانی حقوق کو یقینی بنایا جائیگا۔

آپ ذرااس قرارداد پر غور کریں۔اقتدار کسی بادشاہ کیلئے نہیں ہے کسی صدر اور وزیراعظم یا امیرالمومنین کیلئے نہیں ہے بلکہ پاکستان کے عوام کیلئے ہے جسے عوام اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کریں گے۔علماء اور سیاسی لیڈروں کا یہ متفقہ اعلان تھا کہ اصل حکمران عوام ہیں اور وہ حکمرانی انتخاب کے ذریعے حاصل کریں گے کوئی الوہی حقوق نہیں ہوں گے۔کوئی امیرالمومنین عوام کی مرضی کے خلاف نہیں ہوگا کوئی حاکم اپنی مرضی سے اپنی شوریٰ نہیں بنائے گا۔ بلکہ عوام کے منتخب نمائندوں کا پابند ہوگا۔ کسی کو حق نہیں کہ وہ دولت، خاندان یا بندوق کی طاقت سے عوام کی گردن پر سوار ہوجائے۔

اچھی بات یہ ہے کہ آجکل کا مذہبی سیاسی اتحاد (متحدہ مجلس عمل) بھی اس فکر کی نمائندگی کا دعویٰ کرتا ہے۔عوام کے ووٹ کے ذریعے منتخب ہوکر آنے کے بعد پارلیمنٹ کی بالادستی کا دعویٰ کرتا ہے میں متحدہ مجلس عمل کی نمائندگی نہیں کررہا بلکہ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اہل اسلام کی یہ سوچ اسلامی سوچ ہے۔اسلامی سیاسی فلسفہ حاکم کی بجائے عوام کو اصل مانتا ہے۔مسلمانوں کے پہلے خلفاء ہر لمحے عوام کے سامنے جوابدہ تھے۔ پارلیمنٹ کی جو بھی ابتدائی شکل تھی۔ وہ اس کے سامنے مکمل طور پر جوابدہ تھے۔

قراردادِ مقاصد کے بعد میں ترکی اور ایران کی مثال دوں گا۔ ان دونوں برادر اسلامی ممالک میں کسی نہ کسی درجے میں عوامی طاقت سے ہی مسلمان حکومتیں بنی ہیں۔

عوام کی حاکمیت کا تصور جو اسلام میں چودہ سو سال سے ہے اور اہل مغرب نے سولہویں صدی میں اختیار کیا ہے، ہمارے سیاسی عمل میں آجکل بھی مکمل طور پر عمل پذیر نہیں ہو سکا۔ اکثر اسلامی ممالک میں حکمران عوام کی مرضی کے خلاف عوام کی گردنوں پر سوار ہیں کبھی کہتے ہیں کہ انہیں اللہ نے اقتدار دیا ہے۔ کبھی ہمارے اسلامی دوست کسی نہ کسی شکل میں ان کا ساتھ دیتے ہیں۔

اہل اسلام کو سوچ سمجھ کر یہ پختہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ انہیں عوامیت کا علمبردار بننا ہے۔ اسٹیبلشمنٹ سے تعلق مناسب نہیں ہے۔ اہلِ اسلام کو انقلابی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے عوام کیلئے آگے بڑھنا چاہیے عوامی زبان بولنی چاہیے۔ حکمرانوں اور اقتدار سے دوری اختیار کرنی چاہیے۔ ابوذر و حسینؓ کا کردار ادا کرنا چاہیے۔ زید نفس ذکیہ، ابن تیمیہ، الف ثانی، سنوسی، شبیر احمد عثمانی، عطا اللہ شاہ بخاری، مودودی اور خمینی کا کردار ادا کرنا چاہیے۔ اس تاثر کو شعوری طور پر ختم کرنا چاہیے کہ اہل مذہب جاگیرداری ذہن اور اسٹیبلشمنٹ کے حامی ہیں۔

اہلِ اسلام کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اسلام کا نام لینے والا ہر طالع آزما اسلام کا نمائندہ نہیں ہے۔ پاکستان کا ''مردآہن'' ضیاء الحق ہو یا سوڈان کا جنرل بشیر یہ اسلام کے نہیں بلکہ اسٹیبلشمنٹ کے لوگ تھے جو عوام کی مرضی کے خلاف ان کی قسمتوں کے مالک بن گئے تھے چونکہ ان کے پاس توپ تھی وہ اسلام کو اپنی حکومت کے استحکام کیلئے استعمال کرتے رہے۔ یہ اہلِ اسلام کی نفسیاتی بے بسی ہے کہ ہر مہم جُو جب اسلام کا نام لیتا ہے وہ اس کی حمایت کرتے ہیں انہیں اپنی بے بسی برداشت کرنی چاہیے اور اس بے بسی کو عوام کی حمایت سے طاقت میں بدلنا

چاہیے اسٹیبلشمنٹ کی براہِ راست یا بالواسطہ حمایت نہیں کرنی چاہیے ان کی طاقت اور استحکام کا سبب نہیں بننا چاہیے اس کے برعکس ہر لمحے اور ہر فیصلے کے وقت عوام کو ترجیح دینی چاہیے۔ چاہے اس کا وقتی طور پر نقصان ہو۔ اس سے عوام کی نگاہ میں اہلِ اسلام کا اعتماد بڑھے گا جو بالآخر فائدہ مند ہوگا۔ ایران اور ترکی کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں جہاں اہلِ اسلام خالص عوام کے بل بوتے پر پوری دنیا کی مخالفت کے باوجود اقتدار میں آئے ہیں۔

آپ دیکھ لیں کہ سترہویں آئینی ترمیم (2004ء) کے مسئلے پر ایم۔ایم۔اے نے پھر کوتاہ نظری کا مظاہرہ کیا ہے۔ عارضی مقاصد کی خاطر اسٹیبلشمنٹ کی مضبوطی کا سبب بنے ہیں۔

اس بات کا بھی دھیان رکھنا چاہیے کہ اقتدار میں آنے کے بعد حکومت عوام کی ہونی چاہیے کسی خاص گروہ کی اجارہ داری نہیں ہونی چاہیے بلکہ عام مسلمانوں کی حکومت ہونی چاہیے۔ افغانستان اس ضمن میں مکمل طور پر ناکام ہوا ہے اور اسلام کی جگ ہنسائی کا سبب بنا ہے اس لئے کہ سیاسی فکر خالصتاً ملوکیت والی تھی کہ ایک فرد یا ایک ٹولہ عوام کی قسمتوں کا مالک ہے۔ وہ فرد چاہے خلیفہ ہو یا کہ امیر المومنین، مسٹر ہو یا مولوی کچھ حد تک یہی صورت حال ایران میں ہے۔ اگر علماء نے ایران میں اقتدار عوام کے سپرد مکمل طور پر نہ کیا تو آپ چند سالوں میں ایک اور انقلاب دیکھیں گے جو ولایتِ فقیہہ کے تصور کے خلاف ہوگا اور پھر شاید وہاں عوامی بادشاہت قائم ہو جائے یا پھر استعماریت واپس آنے لگے۔ سعودی عرب کو دیکھیں وہاں اسلام کی ابتداء ہوئی۔ ہمارے مقدس ترین مقامات وہاں ہیں۔ وہاں خالص خاندانی ملوکیت ہے۔ عوام کا حاکمیت سے کوئی تعلق نہیں۔ وہاں کے اکثر علماء اس ملوکیت کے محافظ ہیں۔ ملوکیت کے مخالفوں کے سر علماء کے فتوؤں کے بعد تن سے جدا کیئے جاتے ہیں۔ اس ساری بحث کا ایک اور دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اگر ہم کسی مسلمان بادشاہ کی ملوکیت کے خلاف بات کریں تو ہمیں اسلام کا دشمن سمجھا جاتا ہے۔

میں آپ کو قرآن مجید سے ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کوئی ہزار سال پہلے کی بات ہے یمن میں قوم سبا کی حکومت تھی۔ اپنے زمانے کے یہ سب سے زیادہ تہذیب یافتہ اور امیر لوگ تھے۔ بارش کے پانی کو کنٹرول کرنے کے لئے ڈیم بنا رکھے تھے۔ اپنے خاص جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے مشرق وسطیٰ، افریقہ اور ایشیاء کے مابین تجارت کنٹرول کرتے تھے۔ ملکہ سبا ان کی حکمران تھی۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی فوجوں نے اس کی سلطنت کا محاصرہ کیا تو ملکہ سبا نے اپنے عمائدین کی مجلس بلائی اور سب سے ایک سوال کیا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ لڑنا چاہیے یا کہ ہتھیار ڈال دینے چاہیں؟ قرآن مجید کی سورہ نمل کی آیت نمبر 33 میں عمائدین کا جواب لکھا ہے۔

'ہم قوت والے لوگ ہیں اور سخت جنگجو ہیں! البتہ فیصلہ آپ نے کرنا ہے۔ جو بھی آپ فیصلہ کریں گی ہمیں قبول ہوگا'

ملکہ سباء نے اپنی تقریر میں کہا 'بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اسمیں فساد پھیلاتے ہیں۔ اس کے عزت والے لوگوں کو بے عزت کر دیتے ہیں' اس پر اللہ پاک نے یہ تبصرہ کیا کہ 'ہاں وہ ایسا ہی کرتے ہیں'

میری رائے میں جدید سیاسی تاریخ میں بادشاہت اور فوجی حکومت کے کردار کے بارے میں یہ سب سے زیادہ واضح بیان ہے۔ علامہ اسد نے اس آیت کی تشریح میں لکھا ہے کہ داخل ہونے سے مراد قوت سے داخلہ ہے چاہے بیرونی حملے کی شکل میں ہو یا کہ داخلی طور پر طاقت کے بل بوتے پر اقتدار پر قبضہ ہو۔ بادشاہ سے وہ شخص بھی مراد ہے جس نے طاقت کے زور پر اقتدار حاصل کیا ہو اور اپنے لوگوں کو طاقت کے زور پر غلام بنا رکھا ہو۔ (تفسیرِ قرآن) سید مودودی کے خیال میں ناجائز قابض اس لئے یہ کام کرتے ہیں تا کہ قوم بے بس ہو جائے کوئی ان کے خلاف

کھڑا نہ ہو سکے وہ عزت نفس ختم کرتے ہیں۔ غلامی، خوشامد، جاسوسی وغیرہ کے کلچر کو رواج دیتے ہیں۔

فساد اور بے عزتی بہت جامع اصطلاحات ہیں۔ قرآن نے یہ دو الفاظ استعمال کر کے غاصبوں کی ذہنیت اور ان کے ہتھکنڈوں پر بہت جامع تبصرہ کیا ہے آپ خود دیکھ لیں کیا پچھلے دو سو سالوں میں آپ کے ساتھ کیا یہی نہیں ہوا؟ ایسٹ انڈیا کمپنی، تاجِ برطانیہ ہو یا پاکستان کے غاصب حکمران، سب نے یہاں فساد پھیلایا ہے۔ سب نے یہاں بے عزتی کو رواج دیا ہے۔

### (iv) نیا دینی نظامِ تعلیم

ہمارا دینی نصاب تعلیم غور طلب ہے۔ اس کی کتب ان کا باہمی توازن اور طرزِ تدریس قابلِ اصلاح ہے۔ لیکن ہم اس مسئلہ پر بہت جذباتی ہیں میں یہ بات ابتداء ہی سے واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں مدارس کا حامی ہوں۔ دینی علوم جو ہم تک منتقل ہوئے ہیں یہ انہیں مدارس کی وجہ سے ہیں۔ علماء نے بھوک و پیاس میں نہایت درخشاں روایات قائم کی ہیں۔ لیکن حالات تغیر پذیر ہیں۔ ہمیں بھی حرکت کرنا ہوگی۔ اس ضمن میں چند باتیں غور طلب ہیں۔

قرآن کی تعلیم: قرآن کلام الٰہی ہے۔ حکمت کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔ لیکن اس کو مدارس میں نہیں پڑھاتے بہت کم پڑھاتے ہیں کچھ ترجمہ پڑھاتے ہیں ایک مختصر تفسیر (جلالین) پڑھاتے ہیں اور ایک پارہ بیضاوی کی تفسیر سے پڑھاتے ہیں سوال یہ ہے کیا قرآن اتنی ہی جگہ کا حق دار ہے؟ بالکل نہیں، بالکل نہیں۔ جلالین مختصر اور عمدہ تفسیر ہے مگر کئی سو سال پہلے کی لکھی ہوئی ہے اور ہر کتاب اپنے عہد کے سیاسی و معاشی نظریات کے زیر اثر ہوتی ہے ہمیں چاہیے کہ عہد حاضر کی کوئی تفسیر پڑھائیں۔

قرآن سے زیادہ توجہ حدیث اور فقہ پر دی جاتی ہے۔حدیث کی کم از کم سات کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔فقہ بھی چار سال پڑھائی جاتی ہے۔ظلم یہ ہے کہ قرآن وحدیث پڑھاتے ہوئے تمام طاقت اپنا مسلک ثابت کرنے پر صرف ہوتی ہے۔قرآن وحدیث کی ابدی تعلیمات کے حسن پر بالکل توجہ نہیں ہوتی، چاہیے تو یہ تھا کہ ہم پہلے قرآن پڑھاتے پھر حدیث پڑھاتے اور آخر میں فقہ پڑھاتے تاکہ قرآن کی روشنی میں ہم حدیث سمجھتے۔حدیث کی روشنی میں ہم فقہ سمجھتے۔لیکن ہماری ترتیب الٹی ہے۔ہم پہلے فقہ پڑھتے ہیں گروہی ومسلکی نقطہ نظر پہلے قائم کرتے ہیں اس مسلکی نقطہ نظر کی روشنی میں ہم احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں جہاں ہمیں اپنے مسلک کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔پھر احادیث کی روشنی میں ہم قرآن پڑھتے ہیں۔احادیث میں اعلیٰ ترین روایات سے لیکر موضوع روایات پڑھاتے ہیں۔نتیجہ صاف ظاہر ہے۔مسئلہ یہ بھی ہے کہ قرآن وحدیث کو بھی پرانی روایات کی روشنی میں پڑھتے ہیں۔جنہیں اسرائیلیات کہا جاتا ہے۔

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صداء، لاالہ الااللہ

**پرانا نصاب:** مدارس میں ہم منطق (Logic) پڑھاتے ہیں جس کی بنیاد ارسطو کی منطق پر ہے جو اپنے زمانے کی بہترین تعلیم تھی مگر اب منطق وہ نہیں رہی۔دو ہزار سال میں انسانی علم نے ترقی کرلی ہے مگر ہم وہیں کے وہیں ہیں۔کم از کم 800 سال پرانی کتب ہمارے نصاب میں شامل ہیں جبکہ سولہویں صدی کے بعد جدید منطق علمی محاورے کا حصہ بن گئی ہے۔ہم ریاضی بھی پڑھاتے ہیں۔اقلیدس کو پڑھاتے ہیں۔جو قبل مسیح کا ریاضی دان تھا۔اس کی جدید شکل

ایف ایس سی کی ریاضی ہے۔ چند سال پہلے ایف ایس سی کی ریاضی کی کتاب کے دیباچے میں لکھا تھا کہ یہ اقلیدس کے بنیادی اصولوں پر قائم ہے۔ ایف ایس سی کر کے بچے انجینئر بن جاتے ہیں لیکن مدارس کے طالب علم اقلیدس پڑھکر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ ایف ایس سی کی ریاضی کی کتاب نے اقلیدس کی ریاضی کو بنیاد بنا کر عہد حاضر تک کی فکر کو اپنے اندر سمویا ہے۔ لیکن ہم اقلیدس کے احترام میں اس کی اصلی اور اڑہائی ہزار سال پرانی تعلیمات کے عشق میں گرفتار ہیں۔

یہی حال ادب کا ہے۔ ہمارا نصابی ادب جاہلیت اور عباسی دور کا ہے۔ ہم زمانہ وسطیٰ اور عہد حاضر کے ادب سے ناواقف ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے ہم نے ولی دکنی اور خسرو کو تو پڑھا ہے مگر ہم غالب اقبال اور فیض سے واقف نہیں ہیں۔ ہم ابھی تک ارضیات اور علم الفلکیات کے وہ اصول پڑھاتے ہیں جو عہد یونان کے تھے۔ گیلیلیو اور نیوٹن نے دنیا ہی الٹ دی ہے پہلے زمین دنیا کا مرکز تھی اور اب سورج دنیا کا مرکز ہے۔ ہم ابھی دو ہزار سال پہلے کے زمانے میں رہتے ہیں۔ ہم چاند پر جانے کو ابھی بھی ناممکن سمجھتے ہیں۔

دینی مدارس کا موجودہ نصاب اپنے مرتب کرنے والے کے نام کی نست سے 'درسِ نظامی' کہلاتا ہے۔ یہ نصاب ملا نظام الدینؒ نے ترتیب دیا تھا۔ ملا صاحب لکھنو کے قریب واقع قصبہ سہالی کے رہنے والے تھے۔ آپ کا نسب مشہور صحابی رسولؐ حضرت ابوایوب انصاریؓ سے ملتا ہے۔ آپ کا انتقال 1116ھ میں ہوا۔ آپ بحر العلوم عبدالعلی کے والد گرامی اور شاہ ولی اللہ (1762ء) کے ہم عصر تھے۔ آپ کا 'مدرسہ سہالی' آگے جا کر 'مدرسہ فرنگی محل' بنا جس نے ہندوستان کی علمی وسیاسی تاریخ میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

ملا صاحب نے نصاب کیلئے وہ کتب منتخب کیں جو اس زمانے میں مختلف علوم میں اعلیٰ درجہ (Classic) رکھتی تھیں۔ یہاں ہم اختصار کے ساتھ مختلف مضامین کیلئے ان کی تجویز کردہ کتب، ان کے مصنفین کا نام اور مصنف کی تاریخ وفات لکھیں گے۔ تاکہ اندازہ ہو سکے کہ یہ کتب کتنی پرانی ہیں۔

## صرف ونحو (Grammar)

| کتاب کا نام | مصنف کا نام | سنِ وفات |
|---|---|---|
| المفصل | جاراللہ زمخشری | 538ھ |
| الکافیہ | جمال الدین الحاجب | 646ھ |
| شرح الفوائد الضیائیہ | نورالدین الجامی | 898ھ |
| الخلاصہ | جمال الدین طائی | 672ھ |
| الشافیہ | جمال الدین الحاجب | 646ھ |

زبان بدل گئی ہے مگر ہماری جدید ترین کتاب بھی ساڑھے پانچ سو سال پرانی ہے۔

## بلاغت (Rhetoric)

| | | |
|---|---|---|
| تلخیص المفتاح | شمس الدین القزوینی الخطیب | 739ھ |
| المختصر والمطول | سعدالدین تفتازانی | 792ھ |

یہ آٹھویں صدی کی کتب ہیں۔ اب ہم پندرویں صدی ہجری میں رہتے ہیں۔

## تفسیر (Exigesis of the Quran)

| | | |
|---|---|---|
| جلالین | جلال الدین المحلی | 864ھ |
| | جلال الدین السیوطی | 911ھ |
| مدارک التنزیل | حافظ الدین النسفی | 710ھ |
| انوار التنزیل | عمر البیضاوی | 665ھ |

ہر تفسیر اپنے زمانے کے حساب سے تعبیر ہوتی ہے۔ اب ساڑھے پانچ سو سال گزر گئے ہیں جلالین کو لکھے۔ ہمیں عہدِ حاضر کی کتب بھی پڑھانی چاہیں۔

## اصول حدیث (Principles of Hadith)

| | | |
|---|---|---|
| الفکر مع شرح نزہتہ النظر | شہاب الدین العسقلانی | 852ھ |

نئ علوم کی روشنی میں حدیث پر جو تنقید کی گئی ہے اس کی روشنی میں کچھ جدید کتب کا شامل ہونا لازم ہے۔

## حدیث

| | | |
|---|---|---|
| الموطاء | امام مالک | 197ھ |
| الجامع الصحیح | امام اسماعیل بخاری | 256ھ |
| الجامع الصحیح | امام مسلم القشیری | 261ھ |
| سنن ابن ماجہ | محمد القزوینی | 273ھ |
| سنن ابوداؤد | سلیمان السجستانی | 273ھ |
| الجامع الصحیح | محمد عیسیٰ الترمذی | 279ھ |

| | | |
|---|---|---|
| السنن الاصغریٰ | شعیب السنائی | 303ھ |
| شرح معانی الاثار | محمد الطحاوی | 321ھ |
| مشکوٰۃ المصابیح | محمد الترمذی | 737ھ |

## عقائد وکلام (Theology)

| | | |
|---|---|---|
| عقائد نسفی | نجم الدین | 837ھ |
| شرح عقائد | تفتازانی | 892ھ |
| المواقف | قاضی عضد الدین الایجی | 786ھ |
| شرح المواقف | علی الجرجانی | 816ھ |
| الحاشیہ الزاھدیہ | مرزا محمد الھروی | 1101ھ |

جدید علم الکلام پچھلی دو صدیوں میں ترتیب پایا ہے جس نے پرانے علم الکلام کو یکسر بے معنی بنا دیا ہے ہم ابھی تک نئے علم الکلام سے بے بہرہ ہیں۔ آخری کتاب بھی تین سو سال پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔

## اصول فقہ (Jurisprudence)

| | | |
|---|---|---|
| الحسامی | حسام الدین | 644ھ |
| المنار الانوار | ابوالبرکات النسفی | 710ھ |
| شرح نور الانوار | ملا جیون | 1130ھ |
| التنقیح مع شرح التوضیح | عبید الدین مسعود | 745ھ |
| اصول الشاشی | نظام الدین الشاشی | 328ھ |
| مسلم الثبوت | محب اللہ البہاروی | 1190ھ |

قانون اور اس کے اصول زندہ انسانوں سے تعلق رہتے ہیں۔ اس لئے سوسائٹی کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ مگر ہم نہیں بدل رہے۔

## فقہ (Law)

| | | |
|---|---|---|
| مختصر القدوری | محمد القدوری | 428ھ |
| البدایہ مع الشرح الہدایہ | علی المرغینانی | 593ھ |
| کنز الدقائق | ابوالبرکات نسفی | 710ھ |
| الوقایہ | محمود المحبوبی | 673ھ |
| منیۃ المصلی | سریدالدین الکاشغری | (ساتویں صدی ہجری) |
| تنویر الابصار | شمس الدین انفری | 1004ھ |
| شرح الدر المختار | علاؤالدین | 1088ھ |
| نورالایضاح مع شرح | حسن الوفائی | 1069ھ |
| السراجی | سراج الدین | (ساتویں صدی ہجری) |

آخری کتاب بھی ساڑھے تین سو سال پہلے کی لکھی ہوئی ہے اس طرح آپ عہدِ حاضر کے مسائل سے کیسے عہدہ براء ہو سکتے ہیں؟ نہ صرف سماجی فکر میں تبدیلی آئی ہے بلکہ بالکل نئے علوم آ گئے ہیں مگر ہم وہیں کے وہیں ہیں۔

## اصولِ جدل (Dialectics)

| | | |
|---|---|---|
| الشریفیہ مع الشرح الرشیدیہ | مصطفیٰ الجونفوری | 1083ھ |

## نثر عربی (Arabic Prose)

| | | |
|---|---|---|
| مقامات البدیع | بدیع الزمان الحمدانی | 398ھ |
| مقامات الحریری | علی الحریری | 516ھ |
| نفحۃ الیمن | احمد الشروانی | (تیسری صدی ہجری) |

نثر ترقی کرتی رہتی ہے جبکہ ہم نو سو سال پہلے کا ادب پڑھا رہے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ان قدیم کتب کے کچھ حصے پڑھالیں اور جدید عربی ادب لازمی طور پر نصاب میں شامل کریں۔ زبان زندہ ہوتی ہے بدلتی رہتی ہے مگر ہم ماضی میں قید ہیں۔

## عربی نظم (Arabic Poetry)

| | | |
|---|---|---|
| المعلقات السبع | جمار الراویہ | 155ھ |
| الحماسہ | ابوتمام الطائی | 231ھ |
| دیوان المتنبی | احمد حسین الکندی | 856ھ |

بلاشبہ یہ کمال کا ادب ہے لیکن عہدِ حاضر کا ادب بالکل مختلف ہے زبان بدل گئی ہے موضوعات بدل گئے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ آپ ہومر (Homer) تو پڑھیں لیکن شیکسپیئر، ورڈز ورتھ، شیلے نہ پڑھیں۔ حافظ اور خسرو پڑھیں مگر اقبال اور فیض نہ پڑھیں۔

## منطق (Logic)

| | | |
|---|---|---|
| الشمسیہ | نجم الدین القزوینی | 493ھ |
| القطبیہ | قطب الدین الرازی | 766ھ |
| التہذیب | التفتازانی | 892ھ |
| شرح ملاحسن | ملاحسن غلام مصطفیٰ | 1199ھ |
| ھدایۃ الحکمۃ | اثیر الدین | 660ھ |
| الحکمۃ البالغہ<br>مع شرح الشمس البازغہ | محمد الفاروقی | 1812ھ |

یہ کتب بنیادی طور پر ارسطو (Aristotle) کی منطق کی شرح ہیں حالانکہ مغرب ارسطو سے بہت آگے جاچکا ہے۔نشاۃ ثانیہ اور سائنسی انقلاب کے بعد منطق کی ہیئت اور موضوعات یکسر بدل گئے ہیں مگر ہم ابھی تک ارسطو کی محبت میں گرفتار ہیں۔اور جدید منطق وفلسفہ سے بے نیاز ہیں۔

## علم الہیئت (Astronomy)

| | | |
|---|---|---|
| الملخص فی الہیئۃ | محمود الخوازمی | (ساتویں صدی ہجری) |
| شرح قاضی | موسیٰ محمود الروحی | 840ھ |
| تشریح الافلاک | بہاؤالدین الاملی | 1030ھ |
| الشرح التصریح | لطف اللہ المہندی | 1145ھ |

گیلیلیو، کیپلر اور نیوٹن نے ھیئت کی شکل بدل دی ہے۔ ہماری یہ تمام کتب ان سے پہلے علماء خصوصاً (Ptolemy) کے نظریات پر لکھی گئی ہیں۔اب تو رصدگاہوں کا زمانہ ہے۔ ہماری یہ تمام کتب بالکل بیکار اور غیر متعلق ہیں۔

**حساب وھندسہ** (Arithmatics)

| | | |
|---|---|---|
| خلاصہ فی الحساب | بہاؤالدین الاملی | 1030ھ |
| تحریر اقلیدس | نصیر الدین طوسی | 672ھ |

آپ خود اندازہ لگائیں کہ ہم چار سو سال پہلے والا علم حساب پڑھا رہے ہیں جو دنیا سے رخصت ہو چکا۔ اقلیدس قبل مسیح کی ہے۔اس کی طوسی کی شرح آج سے آٹھ سو سال پہلے لکھی گئی تھی۔ ماضی سے محبت مناسب ہے مگر اتنی بھی نہیں کہ ہمیں غاروں میں رہتے رہیں۔

**طریق تدریس:** طریق تدریس نہایت اہم ہے۔ ہماری علم کی تدریس بھی فرسودہ ہے۔ مدارس میں ذہن کے استعمال کی بجائے حافظے پر زور دیا جاتا ہے۔جس کا نتیجہ ہے کہ عقل کے استعمال اور تخلیق کی طرف میلان نہیں ہے۔ جدید سکولوں میں سوال کرنے کو پسند کیا جاتا ہے۔ مدارس میں سوال کرنا انتہائی بے ادبی ہے۔ہم نے بہت سی احادیث کی غلط تفہیم کی روشنی میں سوال کرنا برا فعل بنا دیا ہے۔حالانکہ پورا قرآن گواہ ہے کہ کائنات کے مظاہر کے بارے میں سوال کرنا سکھایا گیا ہے۔سوال علم کو جلا بخشتا ہے۔ یہ بے ادبی یا گناہ نہیں ہے بلکہ ثواب ہے۔

**جدید زبانوں کی تدریس:** ہمارے نظام تعلیم میں عربی و فارسی کے علاوہ کوئی زبان شامل نہیں ہے۔ فارسی بھی اب ختم ہوگئی ہے۔ البتہ عربی خوب پڑھائی جاتی ہے۔ طرز تدریس ایسا ہے کہ عربی

زبان کا عالم چند فقرے روانی سے نہیں بول سکتا۔ پورا زور صرف ونحو (گرامر) کو یاد کرانے میں لگا دیا جاتا ہے۔

حالانکہ جدید اداروں کے درجہ چہارم کے بچے خوب روانی سے انگریزی بولتے ہیں مدارس میں کوئی جدید زبان نہیں پڑھائی جاتی۔ انگریزی، جرمن، فرانسیسی وغیرہ کو کفر سمجھا جاتا ہے۔ میرے بچپن کے اساتذہ انگریزی پڑھنا کفر سمجھتے تھے۔

**مشکل زبان:** ہماری تمام تصنیفات مشکل زبان میں ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نئی نسل کا رابطہ پرانے ذخیرہ علم سے بالکل کٹ گیا ہے۔ ارسطو اور افلاطون اور شکسپیئر کو ہم پڑھ لیتے ہیں کہ مغرب نے ان کو آجکل کی زبان میں منتقل کر دیا ہے۔ ہم مشکل سے مشکل طرزِ تحریر کو علم کی شان سمجھتے ہیں چاہے کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں۔ سورۃ یٰسین کی آیت ''کل یوم ھو فی شان'' کا ترجمہ اس صدی کے ایک معروف عالم دین نے یوں کیا ہے ''صدور افعال لزوم بالذات ہے'' میری رائے میں قرآن کی آیت تو سمجھ میں آ سکتی ہے لیکن یہ ترجمہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کی انتہائی ضرورت ہے کہ اردو میں لکھی جانے والی اعلیٰ اسلامی کتب کو آسان اردو میں ڈھالا جائے عربی و فارسی کی کتابوں کا ترجمہ کیا جائے۔ تاکہ عام آدمی فائدہ اٹھا سکے۔

**تحقیق:** تحقیق کا تو ہمارے ہاں رواج ہی نہیں، پچھلے کئی سو سالوں سے تحقیق سے مراد کسی پرانے بزرگ کی کتاب کا حاشیہ لکھنا ہے۔ یا پھر کسی کتاب کی شرح لکھنا ہے۔ کسی علمی موضوعات پر نئے علوم کی روشنی میں تحقیقی کام بالکل ناپید ہے۔ ایک زمانے میں مجھے اسلامی معیشت پڑھنے کا شوق

ہوا۔ میں نے دنیا بھر کی کتب اکھٹی کیں، میری دیانتدارانہ رائے میں ایک بھی کتاب ایسی نہیں تھی جسے ٹیکسٹ بک کے طور پر کسی اچھی یونیورسٹی میں پڑھایا جاسکے۔ یہی حال قانون کا ہے، پچھلے پچاس برسوں میں اسلامی قانون پر چند اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں، جبکہ مغرب میں ہر سال قانون کے ہر موضوع پر کئی نئی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ یہاں ہم یہ بات بتا کر خوش ہوجاتے ہیں کہ یہ کتاب اتنی پرانی ہے۔ وہ اس بات پر خوش ہوتے ہیں کہ یہ کتاب اس سال چھپی ہے۔

ہر روز اہل مغرب نئے نئے حوالوں سے قرآن، حدیث، قانون اور ہمارے سماج پر تبصرہ کرتے ہیں۔ اوّل تو ہم تک اور ہمارے روایتی دینی طبقہ تک ان کی آراء پہنچتی ہی نہیں، پہنچتی ہیں تو کم از کم چوتھائی صدی بعد، وہ بھی اگر کسی درد دل والے نے ترجمہ کر دیا تو۔ پھر ہم اس کا علمی وعقلی جواب دینے کیلئے تیار نہیں ہوتے، صرف اس کو اسلام دشمن لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں یا پھر بددعا کر دیتے ہیں اور مطمئن ہوجاتے ہیں کہ اس کا اثر زائل ہوجائے گا۔ ہمیں اندازا ہی نہیں کہ اس زہریلے لٹریچر سے ہماری نئی نسل دین سے دور ہورہی ہے۔ مجھے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ سے روز نئے نئے سوال سننے کو ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک واضح اقلیت دین سے محبت رکھتی ہے لیکن اہل دین سے نالاں ہے اور میری رائے میں بجا طور پر نالاں ہے۔ ہم ان کے ذہن کو نہیں سمجھتے ہمیں ان کی تعلیم کا اندازہ نہیں۔ ان کی زبان ہمیں نہیں آتی۔ اس سے بڑھ کر ہمیں ان سے ہمدردی نہیں۔ اگر ہمیں ان سے ہمدردی ہوتی تو کوشش کرتے تاکہ وہ دین پر قائم رہیں یا دین میں پورے کے پورے داخل ہوجائیں۔ ہم ان کی شکل وصورت دیکھ کر لباس دیکھ کر ان کو گمراہ کہہ دیتے ہیں۔ حالانکہ بہت سے ایسے ہوتے ہیں جن کے دل میں دین کا درد ہوتا ہے۔ ان میں کچھ نماز بھی کبھی کبھار پڑھ لیتے ہیں۔ یہ ہمارا فرض تھا کہ ہم اپنے آپ کو اس نسل کیلئے تیار کرتے۔ ہم اس کام میں مکمل طور پر ناکام ہوئے ہیں۔

ایک نوجوان لڑکی انٹرویو دینے آئی۔اس نے بہت ہی مختصر لباس پہن رکھا تھا۔میں نے اس سے پوچھا کہ آجکل آپ کیا پڑھ رہی ہو؟اس نے جواب دیا کہ'رومی کو پڑھ رہی ہوں' میں پریشان ہوگیا مزید سوال کرنے پر اس نے بتایا کہ'میں امریکہ میں تھی میں نے رومی کا انگریزی ترجمہ خریدا، میں رومی اس لئے پڑھ رہی ہوں کہ وہ اللہ سے محبت کی بات کرتا ہے اور میں اللہ سے محبت کرنا چاہتی ہوں'۔ وہ لڑکی تو یہ بات کرکے چلی گئی لیکن میرا دل ہل گیا کہ جس کی شکل دیکھ کر لباس دیکھ کر میں اسے بے دین اور بے حیا سمجھا تھا وہ اللہ کی محبت کی تلاش میں ہے۔وہ تو اللہ والی تھی۔میں ہی بری رائے بنا کر گنہگار رہوا۔

میرے ساتھ ایک نہایت ذہین لڑکی کام کرتی تھی۔مسلمان تھی لیکن اسکی ساری تعلیم مغربی ممالک میں تھی،عمومی اعمال میں خاصی مغرب زدہ تھی لیکن اسلام کے بارے میں اکثر سوال کرتی رہتی تھی،لگتا تھا کہ اسلام کی روح کو جاننے کی طلب گار ہے۔نبی اکرم ﷺ کی ذاتی زندگی کو جاننا چاہتی تھی میں نے اس کی فرمائش پر اسے سیرت پر Martin Lings کی کتاب دی۔کچھ مطالعہ اور طویل بحث وتمحیث کے بعد وہ اللہ اور رسول پر باقاعدہ ایمان لے آئی۔ مجھے اکثر کہتی کہ محمدؐ بن کے دکھاؤ(یعنی آپؐ کے نقشِ قدم پہ چل کر دکھاؤ)۔

یہ وہ نئی نسل ہے جس کے دل میں اسلام کی رمق تو ہے مگر وہ اپنے ماحول اور تعلیم کی وجہ سے اس سے دور ہے۔موجودہ اسلامی ادب ان کیلئے مناسب نہیں۔ ان کے مسائل مختلف ہیں،ان کے سوال مختلف ہیں،ان کی سوچ کا انداز مختلف ہے، یہ نسل علماء کی روایت پسندی سے سخت نالاں ہے۔میرا سوال یہ ہے کہ ایسی حیران و پریشان نسل کو کون سنبھالے گا؟

سیّد ابوالحسن علی ندویؒ کی اس رائے سے مجھے مکمل اتفاق ہے کہ امتِ مسلمہ کا اصل مسئلہ فکری انحطاط ہے۔آپ خود سوچیں کہ ابن تیمیہ (1328ء) اور شاہ ولی اللہ(1762ء) کے درمیان کونسا مفکر ایسا ہے جس نے دین پر علمی لحاظ سے کام کیا ہو۔یہ وہ زمانہ ہے جس میں مغرب

کے تمام اہل علم، سائنسدان، فلسفی، ماہر معیشت پیدا ہوئے اور ہمیں ڈھونڈنے سے بھی کوئی نام نہیں ملتا۔ شاہ صاحب کے بعد دیکھ لیں کوئی نظر نہیں آئے گا۔ عہد حاضر میں سر سیّد، حضرت اقبال و مودودی کے نام سامنے آتے ہیں۔ سر سیّد کو ہم کافر سمجھتے ہیں۔ اقبال کو ہم نے آہستہ آہستہ قبول کرنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن مودودی صاحب کو ابھی تک ہم عالم ہی نہیں سمجھتے کہ اس کے پاس کسی مدرسہ کی ڈگری نہیں تھی۔

میں علامہ محمد اسد (سابق لیو پولڈ ویس) کے خطوط پڑھ رہا تھا۔ انہوں نے بہت دکھ سے لکھا ہے کہ پاکستان میں ایک خاص طبقہ نے ان کی تکفیر کی تحریک چلائی غالباً اس سے بددل ہو کر وہ مراکش چلے گئے۔ ان کی قرآن پاک کی تفسیر میری رائے میں عہد حاضر میں انگریزی اور اردو میں لکھی جانے والی مختصر تفاسیر میں سب سے بہتر ہے۔ ان کی بخاری شریف کی شرح اور دیگر کتب کمال کی ہیں۔ کچھ لوگ ان کو کافر سمجھتے ہیں کہ انہوں نے بعض معاملات پر روایتی فکر سے اختلاف کیا ہے۔ آپ سر سیّد کو دیکھیں جب ولیم میور نے نبی پاک کی سیرت پر کتاب لکھی جس میں انہوں نے غلط بیانی کی تو سر سیّد نے اپنی پوری جمع پونجی فروخت کر دی ولایت چلے گئے وہاں کئی سال بیٹھ کر اس کتاب کا جواب دیا۔ وہ ایک کمال کی کتاب ہے۔ لیکن ہم ان کو مرتد یا نیچری کہتے ہیں۔ ہم نے ان کی چند آراء کی خاطر ان کی تمام خدمات پر پانی پھیر دیا ہے حالانکہ میں آپ کو ایسی آراء بہت سے علماء قدیم کی کتب سے دکھا سکتا ہوں۔ امام بخاری کو ان کے عہد کے علماء برا بھلا کہتے تھے لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ امام بخاری کی خلق قرآنی کے بارے میں مختلف رائے کے باوجود ہم ان کی کتاب صحیح بخاری کو قرآن کے بعد سب سے صحیح کتاب مانتے ہیں۔ سر سیّد کی علی گڑھ تحریک جس نے ہندوستان میں مسلمانوں کی بقا میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ سر سیّد کی خطباتِ احمدیہ جو سیرتِ مصطفیٰ پر ایک عالمانہ اور شاندار کتاب ہے جس کیلئے

انہوں نے اپنی پوری جائیداد بیچ دی ہمیں نظرنہیں آتی اس لئے کہ ان کے کچھ خیالات ہماری روایتی فکر کے مطابق نہ تھے۔ نہ جانے ہمیں کیا ہوگیا ہے۔ہم ذرہ بھر اختلاف برداشت نہیں کرتے یہ ایک مطلقاً غیر علمی اور غیر عقلی روّیہ ہے جو ہمیں علم دشمنی تک لے گیا ہے۔

مسلمان آجکل ایک قسم کے ذہنی فاقہ (Intellectual Starvation) کا شکار ہیں وہ ذہنی غربت میں مبتلا ہیں۔ وہ حالات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے۔ہم حقائق کا گہرا تجزیہ کرنے کی بجائے دوسروں پر الزام دھرتے رہتے ہیں۔ چیخ وپکار کرتے رہتے ہیں۔ غیروں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ اصل مسئلہ ہمارا اپنا ذہنی افلاس ہے۔ہم محنت نہیں کرتے جان نہیں کھپاتے۔

**تخصّص:** آپ تخصّص (Specialization) کو دیکھ لیں آٹھ دس سال میں ہم درس نظامی پاس کرلیتے ہیں۔ایک دو سال اور لگا کر ہم اسلامی قانون کے مفتی بن جاتے ہیں۔ معاشیات، خاندانی معاملات، بینک، تجارت یعنی زندگی کے تمام معاملات پر اسلامی حوالے سے فتویٰ دیتے ہیں جس سے اختلاف کفر سمجھتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اللہ کے دیئے ہوئے قرآن اور آقائے نامدار کی حدیث وسیرت پر مکمل دسترس رکھتے ہیں۔تمام فقہا کی آراء سے واقف ہیں اور اتنی مہارت رکھتے ہیں کہ زندگی کے کسی بھی مسئلہ پر ہم حتمی رائے دے دیں جو پوری امت پر لازم ہو۔اہل مغرب کا روّیہ اس سے بالکل الٹ ہے۔

آیئے ہم قانون کی ہی مثال لے لیں۔ چودہ سال میں بی۔اے ہوتا ہے۔اس کے بعد تین سال میں ایل ایل بی ہوتا ہے۔اس کے بعد تین سے پانچ سال میں پی ایچ ڈی ہوتی ہے۔وہ بھی کسی ایک شعبہ کے کسی ایک نکتہ پر، مثال کے طور پر اسلام کے قانون معاملات کے

اندر قانون معاہدہ (Contract) پر، یعنی کسی ایک پہلو پر بلکہ پہلو کے بھی ایک پہلو پر۔ اس کے بعد ڈگری یافتہ کسی یونیورسٹی میں سادہ لیکچرر بنے گا۔ تیس سال کی شب و روز تحقیق و تدریس کے بعد وہ پروفیسر بنے گا۔ اگر 20 سال کی اس تعلیم اور تیس سال کی تحقیق کے بعد اس سے قانون معاہدہ کے کسی اور پہلو کے بارے میں پوچھیں تو فوراً کہے گا کہ میں نہیں جانتا، آپ کسی متعلقہ آدمی سے دریافت کریں۔ اسے یہ بات کہتے ہوئے ذرا بھر بھی ندامت محسوس نہیں ہوگی۔ ایک مدارس کے طالب علم ہیں کہ دس سال میں زندگی کے تمام معاملات کے تمام پہلوؤں پر تمام علم حاصل کر لیتے ہیں اور بہت اعتماد کے ساتھ فتویٰ (آخری رائے) دیتے ہیں۔ عہد حاضر میں اس سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں اپنا روّیہ عہدِ حاضر کے روّیے کے مطابق کرنا ہوگا۔

ہماری سوچ عجیب ہے۔ اگر ہم سے کوئی بات پوچھے تو ہم فوراً کہتے ہیں کہ تمام معاملات کا جواب ہمارے آئمہ نے دے دیا ہے۔ ہم یہ نہیں سوچتے کہ بلاشک امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام حنبل، امام مالک، امام جعفر، امام تیمیہ غیر معمولی لوگ تھے۔ غیر معمولی قانون دان تھے۔ انہوں نے قانون کے بنیادی اصول بہت شان سے بیان کئے ہیں لیکن ان شاندار اصولوں کی عہد حاضر میں تطبیق چاہیے بہت سے معاملات اس وقت تھے ہی نہیں۔ عہد حاضر میں پیدا ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر جہاز رانی (Shipping) کا اربوں روپے کا سالانہ کاروبار ہے۔ انشورنس کا کھربوں روپے کا کاروبار ہے ہوائی جہازوں کا کھربوں روپے کا کاروبار ہے۔ کمپیوٹر نے دنیا ہی بدل دی ہے۔ ان میں سے کسی شعبے سے متعلق میں نے کوئی کتاب اسلامی قانون کے حوالے سے نہیں دیکھی۔

ہمیں پدرم سلطان بود (میرا باپ بادشاہ تھا) والی رٹ چھوڑ دینی چاہیے۔ زمانہ بہت آگے جا چکا ہے اب غاروں کا زمانہ نہیں ہے یہ ٹریڈ سنٹر کا زمانہ ہے یہ گھوڑے کا زمانہ نہیں راکٹ

کا زمانہ ہے۔ یہ تیر کا زمانہ نہیں ایٹم بم کا زمانہ ہے۔ یہ جذبات کا نہیں دلیل کا زمانہ ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ اپنی روّش پر غور کرنے کیلیئے تیار نہیں۔ تبدیلی تو بعد کا عمل ہے۔ سوچیں گے تو تبدیل ہوں گے۔

**کتب کی کمی:** ہمارے آباء کی کتابیں بھی ہمارے پاس نہیں ہیں۔ پاکستان کے کتب خانوں میں ابن سینا، الزہراوی عمر خیام، فارابی، ابن نفیس، ابوالہشیم کی کتابیں نہیں ملتیں۔ ان کے تراجم بلکہ اصل مخطوطات آپ کو آکسفورڈ میں ملتے ہیں۔ لندن میں ملتے ہیں۔ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو میں عرض کروں کہ سیرت پاک کی اکثر بڑی کتابیں (سیرت ابن ہشام، طبقات ابن سعد اور سیرت ابن اسحاق وغیرہ) ہالینڈ کی لیڈن یونیورسٹی کے طالب علموں نے تلاش کر کے چھاپی ہیں۔ اگر آج مجھے قدیم مسلم فلسفہ، ادب وغیرہ پر تحقیق کرنا ہو تو میں دیوبند، بریلی نہیں جا سکتا کہ وہاں کچھ بھی نہیں ملے گا بلکہ مجھے لیڈن اور آکسفورڈ جانا پڑے گا کہ وہاں یہ کتب بہت اچھی شکل میں ملیں گی۔ آپ جامعہ اشرفیہ، جامعہ نعیمیہ (لاہور) کے کتب خانے دیکھ لیں۔ اس سے زیادہ کتابیں تو میں نے مغرب میں کئی پروفیسروں کے گھروں میں دیکھی ہیں۔

ہماری کوئی اچھی اسلامی لائبریری نہیں ہے۔ اسلامی قانون پر کتابیں ملتی ہی نہیں۔ لنکنز ان (لندن) میں میں نے ایک بار احسان (Equity) کے قانون پر کتب تلاش کیں۔ جب میں نے کمپیوٹر میں احسان لکھا تو اس نے اپنی سکرین پر 241 کتابوں کی لسٹ، ان کے مصنفین کے نام، چھاپے خانے کا نام، صفحات کی تعداد وغیرہ دس سیکنڈ میں بتا دی۔ ہمارے بہترین مدارس میں نہ تو اتنی کتب ہیں۔ نہ ہی ان کو ڈھونڈنے کا نظام ہے۔ علم کہاں سے آئے گا۔

اب تو تحقیق مزید آسان ہوگئی ہے۔ بازار میں ستر روپے میں کمپیوٹر کی ایک سی ڈی (CD) ملتی ہے۔جس میں چار قاریوں کی آواز میں پورے قرآن کی تلاوت ہے۔ چار تفاسیر ہیں۔صحاح ستہ (حدیث کی چھ بڑی کتب) ہے۔فقہ کی کئی کتابیں ہیں۔سیرت پر کئی کتب ہیں۔تلاش اتنی آسان ہے کہ آپ وضو کا لفظ لکھیں تو قرآن کی تمام متعلقہ آیات، تمام کتب احادیث میں موجود متعلقہ احادیث، فقہ کے کتب سے آراء دس سیکنڈ میں آپ کے سامنے آجائیں گے۔اس کے بعد آپ سب کو پڑھ کر جو چاہیں رائے بنائیں۔ یہ تلاش اگر میں دارالعلوم کراچی کی لائبریری میں کرنا چاہوں تو مجھے ایک ماہ (26لاکھ سیکنڈ) لگیں گے۔اور یہی فرق ہمارا اور مغرب کا ہے۔

دوسری مثال لیں۔امریکہ کی ایک یونیورسٹی (یونیورسٹی آف مینی سوٹا) کی انٹرنیٹ کی ایک ویب سائٹ پر حقوقِ انسانی سے متعلق چار ہزار سے زائد ستاویزات ہیں۔ جو ہمیں مکمل مفت مل جاتی ہیں۔دیکھیں قانون اور سیاست کے ایک پہلو یعنی حقوقِ انسانی پر ایک یونیورسٹی نے ہوا میں اتنی کتابیں ہم سب کیلئے مفت رکھی ہیں۔

میں جب علماء سے اس مسئلے پر بات کرتا ہوں تو سادہ سا جواب ملتا ہے کہ ہمارے وسائل نہیں ہیں۔ مجھے اس دلیل سے بالکل اتفاق نہیں ہے۔مسجد پر اگر ہم ایک چھوٹا سا مینار بنالیں۔چار بڑے مینار نہ بنائیں تو اسی مسجد میں ایک چھوٹی سی لائبریری قائم ہوسکتی ہے۔آپ جانتے ہیں کہ مسجد نبوی کے مینار نہ تھے۔ بیت اللہ کے مینار نہ تھے۔ یہ بعد میں شناخت کیلئے بنے ہیں۔کیا شناخت کیلئے ایک چھوٹا سا خوبصورت سا مینار کافی نہیں ہے؟ حج ایک فرض ہے۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو ہر سال حج پر جاتے ہیں فرض حج کے علاوہ ہر سال اربوں روپے ہم حج وعمرہ پر صرف کرتے ہیں کیا اس رقم کا استعمال لائبریری بنانے پر ہوسکتا ہے؟ حالانکہ تحصیل علم

بہت اعلیٰ عبادت ہے۔ہم عالم کی ایک رات عابد کی سو راتوں سے بہتر سمجھتے ہیں، اس کو بھی چھوڑ دیں، آپ ایک سال میں غیر ضروری مذہبی جلسے وجلوسوں پر اٹھنے والے اخراجات کا جائزہ لیں، تو وہ کروڑوں میں ہوں گے، جو ایک شاندار لائبریری بنانے کیلئے کافی ہیں۔

ہمارے بڑوں نے تحقیق انتہائی نامناسب حالات میں بھی کی ہے کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تیس جلدوں پر محیط کتاب 'المبسوط' امام سرخسی نے جیل کے اندر ایک کنویں میں بیٹھ کر لکھی ہے۔ نہ شاندار مدرسہ اور نہ ہی لائبریری، سرمایہ تھا تو فقط عشق کا تھا جس کا چراغ آج بھی روشن ہے۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

## (v) سائنس کی تعلیم

ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آج ہم سائنسی علم میں کس مقام پر ہیں؟ مغرب کے مقابلے میں ہماری درس گاہیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہماری کتب نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہماری لیبارٹریاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مسلمانوں کی آبادی ایک ارب بیس کروڑ ہے جبکہ یہودیوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ ہے مسلمان ممالک کے سائنسدانوں نے آج تک سائنس میں صرف دو نوبل پرائز حاصل کئے ہیں جبکہ یہودیوں نے 151 حاصل کئے ہیں۔

ہمارے پاس کوئی بھی سائنسدان ایسا نہیں جسے عالمی پیمانے پر احترام سے دیکھا جاتا ہو۔ اگر ہمیں سائنس پڑھنا ہو تو ہم مغرب کی یونیورسٹیوں کے وظائف تلاش کرتے ہیں۔ اگر کوئی تحقیق کرنا ہو تو مغرب کی لیباٹریوں میں پناہ لیتے ہیں۔ کوئی جدید معلومات لینی ہوں تو مغرب کے رسالوں کو کھنگھالتے ہیں۔

ہمیں چاہیے کہ سائنس اور اس کی تعلیم کے بارے میں اپنی فکر کو درست کریں سائنس کو اپنی میراث سمجھیں جیسا کہ تیسرے باب سے واضح ہے۔ سائنس تو ہم نے متعارف کرائی تھی۔ ہم نے پھیلائی تھی۔ اب ہم اس کو مغربی علم سمجھتے ہیں۔ ہمارے دیندار لوگ سائنس کی تعلیم چھوڑ کر مدرسے میں پڑھنا اپنا کمال سمجھتے ہیں حالانکہ یہ اسلام کی واضح تعلیمات کے خلاف ہے۔ ہمیں سائنس کی تعلیم کو اتنا ہی اہم سمجھنا چاہیے جتنا کہ فقہ کی تعلیم کو سمجھا جاتا ہے۔

ہمیں چاہیے کہ اپنے دینی نصاب میں سائنسی تعلیم کو شامل کریں۔ سائنس کی اعلیٰ تعلیم کیلئے تعلیمی ادارے اور تحقیق گاہیں بنائیں بلکہ ایک سائنسی ماحول پیدا کریں۔ جہاں تدریس ہو، تحقیق ہو، تذکیر ہو، تسخیرِ کائنات کی باتیں ہوں، چاند و مریخ پر جانے کی باتیں ہوں، بحرالکاہل کی تہہ میں جانے کی کوششیں ہوں، ایٹم کے دل کو چیرنے کی باتیں ہوں، روح و مادہ کو جوڑنے کی سعی ہو، انسانی فلاح کیلئے نئی ایجادات ہوں، مہلک اور ناقابلِ علاج بیماروں کا علاج دریافت ہو، انسانی زندگی اور طویل ہو، عمومی صحت اور بہتر ہو، عمومی خوراک اور بہتر ہو، ماحول اور بہتر ہو۔ یہ سب ہم پر فرض ہے۔ انسانیت کا قرض ہے۔ یہی انسانی فلاح ہے۔ یہی اسلام ہے۔

میری علماءِ کرام سے گزارش ہے کہ مسلمانوں میں سائنسی تعلیم کا شعور و شوق پیدا کریں۔ تورابورا کے بعد اگر ہم اس کو ضروری نہیں سمجھیں گے تو ہم بھی وہیں دفن ہو جائیں گے۔ امت کو ترغیب دیں کہ غیر ضروری تقاریب (چاہے وہ مذہبی ہوں یا سماجی) پر خرچ کم کریں اور بچت کو سائنس کی ترویج میں لگائیں۔ ہر سال اربوں روپے مذہبی جلسے جلوسوں پر خرچ کئے جاتے ہیں جن کا اسلام کی حقیقی روح سے شاید کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ علماء یہ فتویٰ دیں کہ ایک غیر ضروری مذہبی رسم پوری کرنے کی بجائے سائنس کے ایک طالب علم کی ایک ماہ کی فیس ادا کر دی جائے۔ دوسرا حج و عمرہ کرنے کی بجائے ایک طالب علم انجینئر کے ایک سال کا خرچ

ادا کر دیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا کرنے سے اللہ پاک دیگ بھی قبول کر لے گا۔ حج وعمرہ بھی قبول کر لے گا۔ اللہ کی مخلوق بھی خوش ہوگی۔ مسلمان سائنس بھی پڑھ لیں گے۔

### (vi) برتر اخلاق

مسلمان عمومی طور پر اخلاقی پستی کا شکار ہیں۔ یہ اخلاقی گراوٹ اس وقت اور زیادہ واضح طور پر نظر آتی ہے جب ہم کہتے ہیں کہ ہم آقائے نامدار کے غلام ہیں۔ جن کے بارے میں صحیح کہا گیا ہے۔

بلغ العلیٰ بکمالہ    کشف الدجیٰ بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ    صلو علیہ و آلیہ

(انسانی عظمت آپ کی ذات میں اپنے کمال تک پہنچی آپ کے اخلاق کی روشنی سے دنیا سے اخلاقی اندھیرا ختم ہوگیا۔ آپ انتہائی خوبصورت اخلاق کے مالک تھے۔ انہی خوبیوں کے سبب اللہ عزوجل آپ پر اور آپ کی اولاد پر سلامتی بھیجتے ہیں۔)

ولایت میں جب میں پڑھتا تھا۔ تو قانون کی جماعت میں اساتذہ ہمیں سابق نظائر (Precedents) پڑھاتے تھے۔ جو اعلیٰ عدالتوں نے مختلف مقدمات میں فیصلے دیئے تھے۔ عجب اتفاق ہے کہ اخلاقی گراوٹ والے اکثر شائع شدہ مقدمات ہم لوگوں کے ہوتے تھے۔ میں اکثر اس پر سوچتا تھا اور اندر اندر سے شرمندہ ہوتا تھا لیکن کسی سے اس کا ذکر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دھوکہ، فراڈ، اعتماد شکنی وغیرہ کی اکثر نظیریں ہمارے لوگوں کی وجہ سے بنی تھیں۔ حالانکہ اخلاق اسلام کا سب سے اونچا معیار ہے۔ آنجناب ﷺ کا واضح ارشاد ہے کہ تم میں سے سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں۔

**عاجزی:** اسلام عاجزی سکھاتا ہے۔قرآن میں ارشاد ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کی زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں اس عاجزی کی خاص وجہ ہے جب مسلمان یہ جان لیتا ہے کہ کائنات کی اصل اللہ عزوجل ہیں۔یہ زندگی عارضی ہے آگے جاکر اپنے اعمال واخلاق کا حساب دینا ہے۔اس سے مسلمان نرم خواور مہربان بن جاتا ہے۔اسے بتایا جاتا ہے کہ اگر اللہ سے نرمی چاہتے ہوتو اللہ کی مخلوق سے نرمی کرو۔اگر مخلوق پر رحم نہیں کروگے تو تم پر بھی رحم نہیں کیا جائے گا۔تم مسلمان کی مدد کروگے اللہ پاک تمہاری مدد کریں گے۔تم مسلمانوں کی مصیبت کو دور کروگے تو اللہ قیامت کے روز تمہاری مصیبت دور کرے گا۔یہ تعلیمات اس کو نرمی ورحم سکھاتی ہے۔تنگ ظرفی ختم کرتی ہیں۔

**اعلیٰ اخلاق:** آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ لوگ آپ سے اچھا سلوک کریں تو ان سے اچھا سلوک کرو۔اگر وہ آپ سے برا سلوک کریں تب بھی ان سے اچھا سلوک کرو۔(مشکوٰۃ باب الظلم )امام بیہقی کی سنن شریف میں ایک حدیث ہے کہ کیا میں تم کو دنیاوآخرت کا بہترین اخلاق نہ بتاؤں؟ جوتم سے کٹےتم اسی سے جڑو۔ جوتم کومحروم رکھےتم اسے دو۔ جوشخص تم پرظلم کرے اس کو تم معاف کردو۔

ان احادیث سے واضح ہے کہ ہمارا اخلاق باہمی (Bilateral) نہیں ہے بلکہ یک طرفہ (Unilateral) ہے۔ہم نے اچھائی اس لئے نہیں کرنی کہ کوئی آدمی ہمارے ساتھ اچھائی کررہا ہے۔ بلکہ اس وقت بھی اچھائی سے جواب دینا ہے جب دوسرے ہم سے زیادتی کررہے ہوں گے۔ہم نے یہ سب کچھ اللہ کی رضا، نبی کی اطاعت اوراپنی فلاح کیلئے کرنا ہے۔اگر ہم یہ جذبہ رکھیں گے کہ اللہ کی رضا کیلئے کرنا ہےتو دوسروں کی برائیاں بھی ہمیں ان سے اچھائیاں کرنے پرمجبورکریں گے یہی اخلاق کی تکمیل ہےجس کیلئے آنجناب ﷺ کواس دنیا میں بھیجا گیا ہے(موطاامام مالک )

**معافی:** ہمیں حکم ہے کہ قدرت کے باوجود معاف کردو۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ اے میرے رب تیرے بندوں میں تیرے نزدیک سب سے زیادہ معزز بندہ کون ہے اللہ نے فرمایا۔ وہ شخص جو قدرت پانے کے بعد معاف کردے۔ (البیہقی)

اسلام نے ہمیں معافی سکھائی ہے۔ ابوجہل اسلام کا بدترین دشمن تھا۔ ان کے بیٹے عکرمہ بن ابی جہل بھی باپ کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ فتح مکہ میں آپ ﷺ نے اس کا خون بھی معاف کردیا تھا۔ وہ مکہ سے بھاگ گئے اور یمن میں پناہ گزین ہوگئے۔ ان کی اہلیہ امِ حکیم بنت حارث پہلے مسلمان ہوچکی تھی۔ اس نے آنجنابؐ کی خدمت میں اپنے خاوند کیلئے معافی کی درخواست کی۔ نبی پاکؐ نے یہ درخواست قبول کرلی۔ وہ یمن جاکر اپنے خاوند کو واپس لائیں۔ عکرمہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کرلیا۔ جب وہ آپؐ کی محفل میں آنے لگا تو آپؐ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا۔ عکرمہ بن ابی جہل آپ کے پاس آرہا ہے۔ اس کا باپ اسلام کا سخت ترین دشمن تھا۔ تم اس کے بیٹے کے سامنے اُسکے باپ کو برا بھلا مت کہنا۔ مردہ کو برا کہنے سے زندہ کو تکلیف ہوتی ہے۔ سبحان اللہ کیا احترام آدمیت ہے۔ اپنے مظلوم اصحاب سے کہا جارہا ہے کہ تمہارے بدترین ظالم کا بیٹا آرہا ہے۔ اس کے باپ کے خلاف بات کرکے اس کو تکلیف نہ دینا۔ یہ وہ کشادہ دلی تھی۔ یہ وہ عظمت کردار تھی جس کی وجہ سے مشرق ومغرب نے اسلام قبول کرلیا۔ عکرمہ نے اپنی باقی زندگی اسلام کیلئے وقف کردی۔

نبی ﷺ کی صاحبزادی زینب ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے جارہی تھیں۔ ھبار بن اسود نے آپؓ کے اونٹ کو نیزہ مارا۔ جس سے اونٹ زخمی ہوگیا اور بلک پڑا، حضرت زینب اونٹ سے گرپڑیں۔ اس وقت وہ حمل سے تھیں۔ ان کا حمل ضائع ہوگیا۔ اس کے بعد وہ بقیہ زندگی بیمار رہیں۔ اس ظالم ھبار نے آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر معافی طلب کی۔ آپ نے اس کو بغیر کسی شرط کے معاف فرمادیا۔

حضرت حمزہؓ آپ ﷺ کے محسن چچا تھے۔ وحشی بن حرب اور ہندزوجہ ابوسفیان نے حضرت حمزہ کے ساتھ بہت زیادتی کی۔ وحشی نے حضرت حمزہ کو قتل کیا تھا۔ اس نے فتح مکہ کے بعد مدینے میں حاضر ہوکر معافی مانگی آپ نے معاف فرمادیا۔ ھند نے غزوہ احد میں حضرت حمزہ کا سینہ چیرا اور جگر نکال کر چبایا تھا آپ ﷺ نے اس کو بھی معاف کردیا۔

مجھے ذاتی طور پر اسلامی تاریخ کا ایک واقعہ بہت عجیب لگتا ہے۔ نبی پاک ﷺ کے زمانے میں آپ کی زوجہ محترمہ سیّدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر ایک جھوٹی اور بے بنیاد تہمت لگائی گئی۔ اس غیر اخلاقی وغیر انسانی حرکت میں ایک صحابی رسول مسطح بھی شریک تھا۔ حضرت عائشہ حضرت ابوبکرؓ کی لاڈلی بیٹی تھی۔ اور مسطح حضرت ابوبکرؓ کا ایک غریب رشتہ دار تھا۔ حضرت ابوبکر نے اس کی غربت کے سبب اس کا ماہانہ خرچ اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ جب مسطح نے یہ حرکت کی تو حضرت ابوبکرؓ نے بجا طور پر اس کا وظیفہ بند کردیا۔ آپ سوچیں کہ اوّل تو وظیفہ دینا حضرت ابوبکرؓ کی قانونی ذمہ داری نہ تھی بلکہ آپ نے از سرِ خود اخلاقی بنیادوں پر اس پر یہ کرم کر رکھا تھا۔ دوسرے بے گناہ اور لاڈلی بیٹی پر تہمت کے بعد ان کے پاس ایک اخلاقی جواز بھی تھا۔ سیّدنا ابوبکر صدیق نے جب غم وغصہ کی وجہ سے اس کا وظیفہ بند کیا تو اللہ عزوجل نے وحی نازل کی۔

> کہ تم میں سے جو لوگ اچھی مالی حالت رکھتے ہیں۔ وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ اپنے رشتہ داروں محتاجوں اور اللہ کی راہ میں وطن چھوڑنے والوں کی مدد نہ کریں گے۔ ان کو معاف کردینا چاہیے۔ اور درگزر کرنا چاہیے کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کردے اور اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔
>
> (سورۃ نور۔ آیت 22)

کیا اعلیٰ انسانی تعلیمات ہیں۔ کیا اخلاقی معیار ہے کہ گالیاں کھا کر بھی اپنے دشمن پر کرم جاری رکھنا ہے۔

غصہ پر ضبط: غصہ اخلاق کا قاتل ہے۔ غصہ میں آدمی اخلاقی اصولوں کو بھول جاتا ہے بہادر شاہ ظفر نے کیا خوب کہا ہے۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا چاہے ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم وذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

غصہ کو خوفِ خدا ہی روک سکتا ہے مومنین کی صفت ہے کہ جب انہیں غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں (الشوریٰ) حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسولِ خدا نے فرمایا کہ پہلوان وہ نہیں جو حریف کو پچھاڑ دے۔ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ (صحیح مسلم) آنجناب ﷺ نے حل بھی بتایا کہ جب غصہ آئے تو چپ ہو جاؤ۔

ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ ان کا ایک خدمت گار ان کیلئے گرم گرم چائے لایا جو اس خدمتگار کی کوتاہی کی وجہ سے بزرگ کے پاؤں پر گر گئی۔ اس بزرگ کا پاؤں جل گیا۔ کرب و غصے کے عالم میں انہوں نے اس خدمتگار کی طرف دیکھا۔ وہ سخت پریشان و پشیمان تھا۔ اس نے موقع کی نزاکت سے قرآن کا سہارا لیا۔ اور کہا ''والکاظمین الغیظ (وہ غصہ پی جاتے ہیں) بزرگ خاموش ہو گئے چہرے سے کرب و غصے کی علامات ختم ہو گئیں خدمتگار نے اگلا جز پڑھا۔ والعافین عنّ النّاس (وہ لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں) بزرگ نے فرمایا جا! میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ خدمتگار نے آیت کا اگلا حصہ پڑھا۔ واللہ یحبّ المحسنین (اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے) بزرگ نے فرمایا کہ جا! میں نے تمہیں آزاد کیا۔ یہ ہے اسلامی اخلاق کہ پاؤں جلانے کے بدلے آزادی بخش دی جائے۔

ایک بدو حاضر ہوا۔ آپؐ سے عرض کیا کہ مجھے نصیحت کیجئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ حسن اخلاق سیکھو۔ بدو نے پوچھا حسنِ اخلاق سے کیا مراد ہے۔ آپؐ نے فرمایا لا تغضب (غصہ نہ کرنا)۔

ہماری حالت خاصی توجہ طلب ہے۔ ہمیں غصہ بہت آتا ہے۔ مزاج میں برہمی و درشتی ہر وقت رہتی ہے۔ جتنا بڑا عالم اور جتنا بڑا صوفی ہوتا ہے۔ اس کا جلال اتنا زیادہ ہوتا ہے۔ جتنا بڑا آفیسر، اتنا زیادہ تکبر و غصہ۔ میں کسی زمانے میں قرآن کی تفسیر پڑھ رہا تھا۔ جب کوئی چیز سمجھ میں نہیں آتی تھی تو میں کسی مدرسہ میں کسی عالم دین کے پاس جا کہ سوال کرتا۔ جواب سن کر اگر پھر کوئی سوال کر دیا تو بس حضرت صاحب کو جلال آ جاتا تھا۔ یہی حال اعلیٰ سرکاری ملازمین کا ہے۔ جتنا بڑا آفیسر اتنا زیادہ بدتہذیب، ایک آفیسر نے مجھے ایک دن بہت فخر سے بتایا حالانکہ وہ ریٹائرڈ تھے اور ماشاء اللہ مذہبی ہو گئے تھے کہ جب وہ ڈی سی آفس میں سپر یٹینڈنٹ تھے۔ تو فلاں (ایک وزیر صاحب کا نام لیکر) کو میں نے کبھی اپنے دفتر میں کرسی پیش نہیں کی تھی۔ میں نے سخت بے ادبی کی اور کہہ دیا کہ غالباً یہ آپ کی بداخلاقی تھی۔ اسی کے ٹیکس سے تمہیں تنخواہ ملتی تھی اس کے کام کیلئے سرکار نے تجھے ملازمت دی تھی۔

اخلاق ہمارا ہتھیار ہے۔ اخلاق سے ہم نے دین پھیلایا تھا اب اس حسن سے ہم محروم ہو گئے ہیں۔ ہمارے پھولوں سے خوشبو اڑ چکی ہے۔ انسان کی عظمت کا معیار اس کی تعلیم نہیں۔ اس کی دولت نہیں۔ اس کا عہدہ نہیں بلکہ اخلاق ہے، عاجزی ہے، سادگی ہے، خیر خواہی ہے، ہمیں اخلاقی تحریک چلانے کی ضرورت ہے میں نوجوان تھا۔ مودودی صاحب کا ریڈیو پاکستان سے انٹرویو سُن رہا تھا یہ انٹرویو انہوں نے اپنی وفات سے چند ماہ پہلے دیا تھا۔ ان سے سوال کیا گیا کہ ان کی تمام عمر اسلام کے احیاء کیلئے گزری ہے۔ مسلمانوں کی ترقی کیلئے گزری ہے آپ تجربے کی روشنی میں کیا سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو سب سے زیادہ کس چیز کی ضرورت ہے مولانا نے فوراً جواب دیا کہ مسلمانوں کو اخلاق سیکھنے (Moral Re-armament) کی ضرورت ہے۔ مودودی صاحب کی زندگی کا یہ حاصل تھا۔ یقیناً انہوں نے سو فیصد صحیح فرمایا ہے۔ اخلاق کے بغیر ہم بانجھ ہیں۔ اس پر گہرے سوچ و بچار کی ضرورت ہے۔

## (vii) حقوق انسانی

جنگ عظیم دوئم کے بعد سے حقوقِ انسانی کی تحریک زور پکڑ رہی ہے۔1948ء میں اقوام متحدہ نے حقوقِ انسانی کا منشور تیار کیا۔1976ء میں سیاسی اور معاشی حقوق کے عہد نامے عمل میں آئے۔1981ء میں عورتوں کے خلاف امتیازات کے خاتمے کا دستور نافذ العمل ہوا۔ 1990ء میں بچوں کے حقوق کا دستور عمل میں آیا۔اس کے علاوہ سینکڑوں اعلانات، دستور اور قوانین (مختلف موضوعات) پرنسلِ انسانی نے اتفاق کیا۔اس ساری تحریک کو ہم اہل اسلام مغرب کی سازش اور ہتکنڈہ سمجھتے ہیں اور اس کے سبب ہم نے ایک منفی اپروچ اختیار کر لی ہے۔جو سخت نقصان دہ ہے۔

مذاہب انسانی احترام سکھاتا ہے۔اسلام نے روزِ اوّل سے انسان کو اپنی تعلیمات کا مرکز بنایا ہے۔سیّدنا آدم وابلیس کی کہانی اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ انسان صاحبِ شرف ہے مسجودِ ملائکہ ہے۔توریت، زبور، انجیل اور قرآن مجید کا مقصد انسانیت کی فلاح وترقی ہے۔دنیا میں انصاف قائم کرنا ہے۔قانون کی حکمرانی لانا ہے آنجنابﷺ نے انسانیت کے شرف کی تکمیل کی۔میثاق مدینہ اور خطبہ حجۃ الوداع اس کا مظہر ہیں۔خطبہ حجۃ الوداع حقوق انسانی کا پہلا باقاعدہ چارٹر ہے۔

میں آنجنابؐ کی سیرت سے تین مثالیں دینا چاہتا ہوں۔فتح مکہ سے ذرا قبل نجران کا ایک وفد آنجناب سے بات چیت کرنے مدینہ حاضر ہوا۔آپﷺ نے اس وفد کے خیمے مسجد نبوی کے صحن میں لگائے۔خیمے مسجد سے ذرا باہر بھی لگ سکتے تھے۔وہ لوگ عیسائی تھے۔لیکن آنجناب نے ان عیسائیوں کو مسجدِ نبوی میں ٹھہرایا۔ان کے گھوڑے بھی مسجد کے صحن میں تھے۔وہیں چارہ کھاتے تھے۔ہمارا یہ حال ہے کہ کسی دوسرے فرقے والے کو اپنی مسجد میں نہیں

گھسنے دیتے۔ مسجد دھوتے ہیں کہ ناپاک ہوگئی ہے۔ پھر بھی ہم کہتے ہیں کہ ہم محمدﷺ کے غلام ہیں۔ کیا ہم کسی عیسائی یا یہودی کو اپنی مسجد میں آنے دیتے ہیں؟ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آنجنابﷺ اس وقت کمزور تھے؟ بالکل نہیں! اسلام نے آدھے عرب پر قبضہ کرلیا تھا اور نجران والے تو کمزور لوگ تھے۔ جو کچھ آنجنابﷺ نے کیا وہ صرف اور صرف اخلاقِ محمدی کی وجہ سے کیا۔ اس میں کوئی مصلحت نہیں تھی۔ خالص اخلاق تھا۔ احترام آدمیت تھا۔ کیا ہم اپنی اقلیتوں سے یہی سلوک کرتے ہیں۔ ہماری تو ریاست ہے۔ یہاں عیسائی مغلوب ہیں۔ لیکن ہمارا سلوک بھیانک ہے جو لوگ قادیانی نہیں بھی ہوتے ہم ان کو زبردستی قادیانی بنادیتے ہیں۔ ان کی زندگی اجیرن کردیتے ہیں۔ میں آپ کو اس ضمن میں دو مثالیں دینا چاہتا ہوں۔

میں 1990ء میں عمرکوٹ (سندھ) میں تعینات تھا۔ ایک مذہبی گروہ نے جلسہ کرنا چاہا۔ مذاکرات ہوئے۔ شرائط طے پا گئیں۔ جلسہ ہوا تو تمام شرائط کو پامال کردیا گیا۔ میں نے اس پر قانون کے مطابق کارروائی کی۔ کچھ علماء گرفتار ہوئے۔ میں خود جیل میں جاکر ان سے ملا۔ ان کے اچھے کھانے کا انتظام کیا، چائے نماز پیش کی، بے گناہ یا کم گناہگار فوراً رہا کردیئے۔ چند روز کے بعد میرے خلاف پورے سندھ میں پوسٹر لگ گئے کہ میں قادیانی ہوں۔ اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ عمرکوٹ کے علماء نے اپنے خطبات میں اس کی تردید کی اس لئے کہ مجھے ذاتی طور پر جانتے تھے۔ اور سب سے بڑی مقامی مسجد کے خطیب اسلامی یونیورسٹی میں میرے شاگرد رہ چکے تھے۔ کیا یہی اسلام ہے؟

دوسری مثال ایک اعلیٰ سرکاری عہدیدار کی ہے۔ وہ خود صاحب علم ہے پانچ وقت کی نماز باجماعت ادا کرتا ہے۔ اس کی تمام اولاد اعلیٰ ترین دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی عمل وعلم سے مزیّن ہے۔ ایک سیاستدان نے اس کی دیانتداری سے تنگ آکر ایک بار لکھ دیا کہ وہ قادیانی ہے۔ اس کے بعد بہت سی مذہبی جماعتیں اس کو قادیانی لکھنے لگیں۔ آپ اس کی تکلیف کا اندازہ

لگائیں کہ معاشرے میں اس کی کیا حالت ہوگی۔کیا یہی اسلامی تعلیم ہے کہ آپ بلاتحقیق کسی شریف آدمی کی زندگی حرام کردیں؟

مجھے اس آفیسر کو قادیانی کہنے والی جماعت کے کچھ اکابرین کچھ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مل گئے۔میں نے نہایت درد سے گلہ کیا۔ان کا جواب ملاحظہ فرمائیں ''اس صاحب سے کہیں کہ وہ اس کی تردید کردیں'' میں نے کہا، لاحولا ولاقوۃ۔وہ پریشان ہوگئے۔میں نے عرض کیا کہ مجھے آپ کے جواب سے نہایت دکھ ہوا ہے۔یہ آپ کا کام تھا کہ آپ تحقیق کرتے سنی سنائی بات پر عمل نہ کرتے۔ثبوت کا بوجھ ہر ضابطے میں آپ پر ہے اور آپ عالم دین کہلانے کے باوجود اس ملزم شخص سے کہہ رہے ہیں کہ وہ اپنی صفائی پیش کرے۔میں پوری فصاحت و بلاغت استعمال کرکے ان اکابرین کو یہ بنیادی بات نہ سمجھا سکا کہ ہر آدمی احترام کے لائق ہے ہمیں ثبوت کے بغیر لوگوں کی زندگیاں تباہ نہیں کرنی چاہیں۔میں نے انہیں فیض احمد فیض کی ایک نعت کا یہ شعر سنایا۔

آتش فشاں ز قہر وملامت زبانِ شیخ
از اشک تر ز دردِ غریبان ردائے تو

(اے حضورﷺ! غریبوں کے درد میں روتے روتے آپ کی چادر آنسوؤں سے تر ہوجاتی تھی۔لیکن شیخ کی زبان سے غصہ وملامت کی آگ نکل رہی ہے)

آیئے میں آپ کو سیرت سے دوسری مثال دوں۔آنجنابﷺ مسجد نبوی میں اپنے غلاموں کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ایک بدو آیا اور اس نے مسجد نبوی کے صحن میں پیشاب کرنا شروع کردیا صحابہ کرام اٹھ کر بھاگے تاکہ اس کو روکیں۔آپؐ نے سختی سے فرمایا کہ اسے تنگ نہ کرو۔پیشاب کرنے دو۔اس کی مجبوری ہوگی۔قربان جاؤں یہ تھے ہمارے نبی۔ہم غلام کہلاتے ہیں۔لیکن دوسرے مسلمان کو پیشاب تو کیا اپنی مسجد میں نماز نہیں پڑھنے دیتے کیا نسبت ہے۔کیا قربت ہے؟ کیا بعد المشر قین ہے۔تو کجا و من کجا۔

آ یئے سیرت سے تیسری مثال سنیں؟ آنجنابؐ راستے پر سے گزر رہے تھے۔ صحابہ کرام ساتھ تھے راستے میں ایک کتیا اپنے بچوں کو دودھ پلا رہی تھی۔ آنجناب نے صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ ہمیں راستہ چھوڑ دینا چاہیے اس سے کتیا پریشان ہوگی۔ بچے دودھ نہیں مکمل کرسکیں گے۔ سبحان اللہ! یہ تھے وہ محمد ﷺ جن کو ہم مانتے ہیں۔ یہ وہ اخلاق تھا جس نے عرب وعجم کو جیت لیا۔ ایک ہم ہیں کہ دعویٰ تو محبت کا کرتے ہیں لیکن آنجنابؐ سے کوئی تعلق نہ ہے۔ ہماری صورت حال خسارے والی ہے۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی، تمام بولہبی است

(مصطفیٰؐ تک اپنے آپ کو پہنچاؤ کہ وہی اصل دین ہیں اگر آپ آنجناب تک نہ پہنچے تو یہ بولہبیت ہوگی۔ اسلام نہ ہوگا۔)

عورت آدھی انسانیت ہے دنیا میں کم وبیش پچاس فیصد خواتین ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارا رویہ ان کے بارے میں اسلامی نہیں ہے بلکہ روایتی معاشرتی ہے۔ جو اصولاً بھی غلط ہے اور عہدِ حاضر کے تقاضوں کے بالکل برعکس ہے۔ عورت کے ضمن میں ہم عیسائی نظریات سے بہت متاثر ہیں۔ عیسائی عقیدے کے مطابق آدم علیہ السلام کی ابتدائی حکم عدولی کی وجہ اماں حوا تھی اس فکر کی وجہ سے عورت برائی وفساد کی جڑ بنی۔ ہر بری شے عورت سے منسوب کی جانے لگی۔ عورت کی اس اخلاقی کم تری کا اظہار ہر انسانی فکر اور رویے سے ظاہر ہونے لگا۔ عہد حاضر میں عیسائیوں نے حقوقِ انسانی کی تحریک کی وجہ سے عورتوں کے بہت سے حقوق مان لئے۔ لیکن ہماری فکر پر ابھی تک ان اسرائیلیات (یہود ونصاریٰ کی کتابوں کی روایات) کا اثر ہے حالانکہ

قرآن بہت واضح ہے۔سورۃ بقرہ میں ارشاد ہے کہ''(شیطان) نے ان دونوں کو غلط راستہ دکھایا''۔یعنی حوا علیہ السلام نے آدم علیہ السلام کو گمراہ نہیں کیا بلکہ دونوں اکٹھے شیطان کی باتوں میں آ گئے۔اس آیت کی وجہ سے ہمیں انسانی برابری کا سبق ملتا ہے۔لیکن ہم نے بھی عورت کو برائی اور جنس کا مجسمہ سمجھ لیا ہے۔ظلم یہ ہے کہ نئی حقوقِ نسواں کی تحریک بھی ہمارے ہاں افراط وتفریط کا شکار ہے۔

آنجناب ﷺ کا واضح ارشاد ہے کہ تم میں سے سب سے بہتر وہی ہے جو اپنے اہل وعیال سے بہتر ہو۔آقائے نامدار کا سلوک حضرت فاطمہؓ سے ملاحظہ فرمائیں۔آپ کبھی ان کے گھر بغیر دستک کے نہیں تشریف لے گئے۔سیّدہ فاطمہؓ جب بھی تشریف لائیں نبی پاک نے کھڑے ہوکر ان کا استقبال کیا۔سیّدہ خدیجہؓ کی وفات کے بعد نبی اکرم اپنی زندگی میں ان کی سہیلیوں کو عید پر تحفے بھیجتے رہے۔فتح مکہ کے روز نبی اکرم ﷺ نے اپنا خیمہ بیت اللہ میں نہیں لگایا۔قربان جاؤں آپ نے اپنے قیام کیلئے خانہ کعبہ کی بجائے سیّدہ خدیجہؓ کی قبر کو پسند فرمایا۔اس سے زیادہ اپنی بیوی کی محبت اوراحترام کیا ہوسکتا ہے۔

ایک ہم ہیں کہ ہر لمحے کہتے ہیں کہ عورت جوتی برابر ہے۔عورت فتنہ ہے۔اس ضمن میں ہم نے بہت سی ایسی روایات کا سہارا لیا ہے جو جرح وتعدیل کے اصولوں پر پورا نہیں اترتیں اور بعض احکام خاص حالات کیلئے تھے ہم نے انہیں عمومی بنالیا ہے جو قانون اور اصولِ تعبیر کے تمام مروجہ اصولوں کے خلاف ہے لیکن ہم اس کو ماننے کیلئے تیار نہیں۔

ایک سے زائد شادیوں سے متعلق قرآن بہت واضح ہے۔

یتیموں کو ان کا مال دے دو۔ان کے اچھے مال سے اپنا برا مال
تبدیل نہ کرو۔ان کے مال میں اپنا مال ملا کر مت کھاؤ۔یہ بہت

بڑا گناہ ہے۔اگر تمہیں ڈر ہے کہ تم یتیموں کے معاملے میں
انصاف نہیں کرسکو گے تو (ان سے نکاح نہ کرو) ان سے نکاح کرو
جو آپ کو پسند آئیں (ان کے علاوہ دوسری) عورتوں سے دو دو
تین تین اور چار چار اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم ان میں عدل نہیں
کرسکو گے تو پھر ایک ہی۔۔۔۔۔اس سے تم ایک کی طرف جھکنے
سے بچو گے (سورۃ النساء۔آیت ۳) (ضیاء القرآن)

امام سعید ابن جبیر، قتادہ اور دیگر تابعین کی رائے یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح تم یتیموں کے حقوق کے بارے میں خوفزدہ ہو۔اس طرح عورتوں کے حقوق کے بارے میں بھی فکر مند ہونا چاہیے۔

اس سے ثابت ہوا کہ اصل مسئلہ یتیم بچیوں کے حقوق کا بیان ہو رہا تھا۔ان کے حقوق کی حفاظت کیلئے ان سے شادی کے نام پر ظلم کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

دوسری شرط یہ ہے اگر تم انصاف کرسکو۔یہ آیت تعددِ ازواج کے جواز کو عدل کی شرط سے مشروط کرتی ہے جو شخص عدل کی شرط پوری نہیں کرتا مگر ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کے جواز سے فائدہ اٹھاتا ہے وہ اللہ کے ساتھ دغا بازی کرتا ہے۔حکومت اسلامی کی عدالتوں کو حق حاصل ہے کہ جس بیوی یا جن بیویوں کے ساتھ وہ انصاف نہ کر رہا ہو ان کی داد رسی کریں۔
(تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ 321)

تیسرا پہلو یہ ہے کہ واضح کیا جا رہا ہے کہ ایک ہی بہتر ہے تا کہ تم ایک کی طرف جھک کر برائی کے مرتکب ہو گے اور یہ انصاف کے خلاف ہوگا۔ہم نے اس آیت کو اس کے تناظر سے باہر نکال لیا اور انصاف کی شرط کو بھی بھول گئے۔اور شادی کو عیاشی کا ذریعہ بنالیا۔یہ حکم نہیں تھا جو

اہل اسلام پر فرض تھا بلکہ ایک خاص تناظر میں ایک مشروط رخصت تھی۔ یہ عمومی حکم نہیں تھا بلکہ خاص حالات میں ایک گنجائش تھی۔

آیئے آنجنابؐ کی سیرت کو ملاحظہ کریں (آپ ﷺ کی اپنی شادیوں کو ہم یہاں موضوع نہیں بنا سکتے اسی لئے کہ قرآن پاک واضح ہے کہ یہ رعایت صرف آپ کیلئے تھی) بخاری شریف نے حضرت مسوبن مخرمہ سے ایک حدیث نقل کی ہے انہوں نے کہا کہ

> 'میں نے منبر پر آنحضرتؐ کی زبان سے سنا آپؐ فرماتے تھے کہ ہشام بن مغیرہ کی اولاد میں سے ایک نے مجھ سے یہ اجازت مانگی کہ وہ اپنی لڑکی کا نکاح علیؓ ابن ابی طالب سے کر دیں، تو میں تو اجازت نہیں دیتا، ہرگز اجازت نہیں دیتا، کبھی اجازت نہیں دیتا ۔ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ابوطالب کا بیٹا میری بچی کو طلاق دے دے اوران کی بیٹی سے نکاح کرلے۔ بات یہ ہے کہ فاطمہ میرا ایک ٹکڑا ہے جو اس کو برا لگے مجھے بھی برا لگتا ہے اور جس چیز سے اس کو تکلیف ہو مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ (بخاری۔ کتاب النکاح)

سوال یہ ہے کہ کیا آنجناب کو صرف اپنی بیٹی کے جذبات کی فکر تھی یا آپ انسانی فطرت کے بارے میں ارشاد فرمارہے تھے۔ میرا ایمان ہے کہ نبی صرف اپنی بیٹی کیلئے کوئی حکم جاری نہیں کرسکتا وگرنہ آپ یہ نہ فرماتے کہ میں فاطمہؓ کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا اگر وہ چوری کرتیں۔ آنجناب کی سیرت سے یہ بات واضح ہے کہ دوسری شادی عمومی معاملہ نہیں ہے۔ یہ دولت کے اظہار یا ہوس رانی کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ اصولی اورانسانی مسئلہ ہے۔

اس طرح عورت کی گواہی کا مسئلہ ہے۔ خاص شرائط اور خاص تناظر والی ہدایات کو عمومی قانون بنا دیا گیا ہے۔ عہد حاضر میں جب عورتیں مالی معاملات میں برابر کی شریک ہیں۔ ان کے بھولنے کا خطرہ نہیں تو ان کی گواہی عمومی طور پر آدھی کیسی ہوگی۔ قرآن واضح ہے کہ اس طرح کی گواہی کا محل تب ہے جبکہ مالی معاملات تحریر کئے جا رہے ہوں اور وہ مستقبل سے متعلق ہوں اور عورت کے بھولنے کا خطرہ ہو۔ تب دو عورتیں گواہ بنیں گی اس کا سادہ مطلب یہ ہوا کہ یہ ہدایات اُن معاملات کے بارے میں نہیں ہوں گی جو مستقبل کے مالی معاملات کے بارے میں نہ ہوں۔ دوسرے اگر عورت کے بھولنے کا خطرہ نہیں تو پھر بھی یہ ہدایت نہیں ہوگی۔ اس واضح حکم کے باوجود ہم عورت کو آدھا کہتے ہیں مالی معاملات سے دور سیدھی سادی عورت اور جدید تعلیم یافتہ بینکر میں ہم فرق نہیں کرتے اس رویّے سے اسلام پر حرف آ رہا ہے۔

یہی حال حدود کے قوانین کا ہے۔ وہ بہت جلدی میں لکھے گئے تھے۔ اور خاص طرح کی دینی تعبیر کے تحت لکھے گئے ہیں جس کی وجہ سے بعض اوقات زنا بالجبر کا شکار ہونے والی عورت پر بھی حدود کا مقدمہ بن جاتا ہے۔ اور یہ بات 2 سال پہلے زعفران بی بی کیس میں فیڈرل شریعت کورٹ نے واضح کی کہ یہ غلط ہے۔ ہمیں حدود اللہ اور حدود آرڈی ننس میں فرق کرنا چاہیے حدود کو قائم رکھتے ہوئے حدود آرڈیننس پر غور کرنے میں ہرج نہیں ہے۔

ہم نے عورت کو سوسائٹی سے باہر کر دیا ہے وہ زندگی کے معاملات سے بھی باہر ہے۔ ظلم تو یہ ہے کہ ہم نے اس کو مسجد سے بھی باہر کر دیا ہے تاکہ وہ نماز باجماعت سے بھی جائے۔ عید سے بھی جائے اور خیر کی بات سننے کے موقع سے بھی محروم ہو جائے۔ ہم نے ایران میں اور مغرب میں پورے حجاب کے ساتھ خواتین کو کام کرتے دیکھا ہے اس شان وحیا کے ساتھ کہ کسی مرد کو ان کی طرف بری نظر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی لیکن مسلمان ممالک میں ہم نے مرد و عورت

کی بے جا تفریق کردی ہے۔حیا کے دائرہ میں بھی ہم عورتوں کو کام نہیں کرنے دیتے اس کے آسان حل بھی ہو سکتے تھے۔مثال کے طور پر پرائمری تعلیم میں صرف خواتین اساتذہ ہو سکتی تھیں۔وہ شفقتِ مادری کی بدولت بچوں کو بہتر تعلیم دے سکتی ہیں۔میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ عہد حاضر میں جب انسان بیدار ہے، تعلیم عام ہے، حقوقِ نسواں کی تحریک زوروں پر ہے، ہمیں اپنے رویّوں کو بدلنا چاہیے۔ہم اپنی موجودہ فکر کا دفاع نہیں کر سکتے۔

### (viii) فکری غلامی سے نجات

ہم غلامی کا شکار ہیں۔مذہبی طبقہ ماضی کا غلام ہے۔جدید طبقہ مغرب کا غلام ہے۔ مذہبی طبقہ پانچ سو سال پہلے کے ذہنی فریم ورک میں رہتا ہے۔جبکہ جدید طبقہ مغرب کو ہی تہذیب وعلم کا منبع سمجھتا ہے۔اس ذہنی غلامی کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے فکری اجتہاد اور علمی تحقیق چھوڑ دی۔ مغرب فکر و تحقیق میں امام بن گیا۔اچھائی اور برائی کا معیار بن گیا۔ہم سوتے رہے مغرب نے سفر جاری رکھا۔اب مغرب قلم اور تلوار دونوں صورتوں میں غالب ہے۔ہمارے مغلوب اور آرام پرست ذہنوں نے مغرب کو حق وترقی کا معیار مان لیا۔یہ ایک انتہا ہے۔مذہبی طبقہ دوسری انتہا پر ہے۔ان کے نزدیک مغرب سے آنے والی ہر شے کفر ہے، گمراہی ہے۔ان کا خیال ہے کہ مغربی فلسفہ وسائنس نے دہریت، الحاد اور مادہ پرستی کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

مذہبی طبقہ بھی عیسائی پادریوں کی تاریخ دہرا رہا ہے۔یورپ میں جب نشاۃ ثانیہ (Rennaissane) شروع ہوئی تو پادریوں نے ان نئے نظریات کو اپنے غلط نظریات (جو قدیم یونانی فلسفہ وحکمت پر قائم تھے) کے خلاف سمجھا۔ان کے نظریات کھوکھلے تھے۔اس لئے انہوں نے نئے نظریات کو کفر سمجھ کر دبانے کی کوشش کی۔مذہبی عدالتیں (Inquisitions) قائم کی

گئیں جنہوں نے نئی علمی تحریک کے لوگوں کو سخت وحشیانہ سزائیں دیں۔ نئی علمی تحریک اس ظلم سے نہ دبی۔ اس لئے کہ وہ عقلی تھی اور عہد کے تقاضوں کے مطابق تھی۔ فتح اس نئی تحریک کی ہوئی اور اہل مذہب کی غلط روش کے سبب مذہب کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اصل میں تو یہ جنگ نئی فکر کے لیڈروں اور پادریوں کے درمیان تھی لیکن چونکہ پادری مذہب کے نام پر یہ جنگ لڑ رہے تھے اس صورتِ حال نے آزاد خیالی اور مذہب کے درمیان جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ یہی صورت حال کم وبیش ہماری ہے۔ ہمارا مذہبی طبقہ بھی عیسائی پادریوں کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔

ہمیں بہت مشکل کام درپیش ہیں۔ اولاً ہمیں مغرب سے آنے والی ہر شے کو کفر سمجھنا چھوڑ دینا چاہیے۔ اسلام کے اس سنہری اصول کی روشنی میں کہ خذ ماصفیٰ دع ماکدر (اچھی شے قبول کرلیں اور بری شے چھوڑ دیں) ہمیں فلٹر لگانے چاہییں۔ اچھے و برے میں فرق کرنا چاہیے مغرب کی اچھی چیزوں (محنت، دیانت، علم وتحقیق کی جستجو، حقوقِ انسانی کا احترام، فلاحی ریاست، جمہوری اقدار، مستقبل کی طرف میلان وغیرہ) کو قبول کرنا چاہیے۔ کہ حکمت ہماری گمشدہ متاع ہے۔ جہاں سے ملے، لے لینی چاہیے۔

دوئم ہمیں ذہنی غلامی سے نجات حاصل کرنی چاہیے۔ مغربی فکر وعمل پر ناقدانہ نظر ڈالنی چاہیے۔ مغرب چراغ راہ ہوسکتا ہے۔ اس کو منزل نہ بنائیں مغرب کی روش میں جو مذہب دشمنی اور حیوانیت ہے اس کو سمجھیں، اپنی اقدار پر اعتماد کرنا سیکھیں اور ظاہری چمک دمک سے متاثر ہونا چھوڑ کر حقیقت کی گہرائی کو دیکھیں کہ کیا انسان واقعی خوش ہوا ہے یا جدید تہذیب نے اس کو مزید غم زدہ اور پریشان حال بنا دیا ہے!

تیسرے ہمیں فکر کا امام بننا ہوگا۔ فکر وتہذیب کا رخ متعین کرنا ہوگا۔ یہ انتہائی مشکل کام ہے اسلئے کہ ایک تو ہم کمزور ہیں، دوسرے ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں تیسرے فی الحال تو ہم

زمانے سے بھی پیچھے ہیں۔لیکن تاریخ میں ایسا ہوتا رہا ہے۔کہ کمزور غالب آجاتے ہیں۔
عہدِ اوّل میں روم و یونان غالب تھے۔فارس غالب تھا۔ہم نے کمزوری کے باوجود ان سے قیادت لے لی تھی۔اب بھی ہمیں اتنی اندرونی طاقت حاصل کرنا ہوگی کہ ہم غلامی کے مدار سے نکل کر امامت کی کھلی فضا میں آئیں۔قرآن میں واضح ہے کہ

تلک الایّام نداولھا بین الناس (العمران140)

دن لوگوں اور قوموں کے درمیان پھرتے رہتے ہیں۔

غالب مغلوب بن جاتے ہیں اور مغلوب غالب بن جاتے ہیں شرط یہ ہے کہ ہمیں کچھ زندگیاں وقف کرنا ہوں گی۔کچھ جوانیاں لٹانا ہوں گی اندھیروں میں چراغ جلانا ہوں گے علما و اہل دانش کا کام ہے کہ وہ غلامی کے خدوخال واضح کریں۔قوم کو اور بالخصوص نوجوانوں کو ترغیب دیں کہ نقش ونگار دیر میں خونِ جگر تلف نہ کریں اپنی خودی نہ بیچیں بلکہ اپنی خودی میں ڈوب جائیں۔اخلاقی قوت حاصل کریں کہ اصل فتح اخلاقی قوت کی ہی ہوتی ہے۔

### (ix) تصوف کی اصلاح

اسلام کے روحانی پہلو کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے۔انسانیت روحانیت کی تلاش میں ہے۔نئ مسلم نسل اسلام کی ظاہرداری سے نالاں ہے۔وہ اسلام کی روح چاہتی ہے۔عام طور پر اسلام کے روحانی پہلو کو تزکیہِ نفس یا تصوف کہتے ہیں۔

اسلام کا اصل مقصد بندے کو اس کے رب سے جوڑنا ہے اس کا کچھ حصہ ظاہری شریعت (قانون) سے متعلق ہے۔اور کچھ حصہ باطنی اخلاقیات یا روحانیات سے جسے تصوف بھی کہا جاتا ہے۔شریعت بنیادی فریم ورک عطا کرتی ہے تا کہ انسان بھٹکنے سے بچ جائے لیکن زیادہ اخلاقی ترقی کا دارومدار انسان کی اپنی روحانی طلب پر ہے۔جتنی طلب ہوگی اتنی ہی زیادہ ترقی ہوگی تصوف روحانی طلب و ترقی سے بحث کرتا ہے۔

صوفیاء نے خدا سے خوف کی بجائے محبت کا درس دیا ہے۔ ان کے نزدیک سورۃ المائدہ کی آیت نمبر 54 مشعل راہ ہے کہ

'خدا ان کو محبوب رکھتا ہے اور وہ خدا کو محبوب رکھتے ہیں'

خدا سے محبت پر زور دینے کی وجہ سے انہوں نے خدا کی مخلوق سے بھی محبت کا درس دیا۔ بابا فرید گنج شکر کا مشہور قصہ علامتی طور پر مفید ہے۔ ان کے ایک مرید کہیں سفر سے آئے تو وہاں کی سوغات کے طور پر قینچی لائے۔ آپ نے فرمایا کہ تم میرے لئے کاٹنے کی چیز لائے ہو۔ اگر تحفہ لانا ہی تھا تو سوئی دھاگہ لاتے کہ وہ جوڑنے کے کام آتا ہے۔ صوفیا کی یہی خصوصیت تھی جو دین کی اشاعت کا سبب بنی۔ اس محبت کے درس کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں رقابت کم ہوگئی۔ اس میل جول سے لوگ اسلام سے متاثر ہوئے اور اسلام میں داخل ہوئے۔ (فکرِ اسلامی صفحہ 131)

مشہور انگریزی شاعر Hunt نے 1834 میں حضرت ابو بن ادھمؒ کے حوالے سے اس مسئلہ پر خوبصورت نظم لکھی ہے۔ جس میں اس بات کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی مخلوق سے محبت کرنے والوں سے اللہ محبت کرتے ہیں۔

**Abou Ben Adhem**

Abou Ben Adhem - may his tribe increase -
Awoke one night from a deep dream of peace,
And saw, within the moonlight in his room,
Making it rich, and like a lily in bloom,

An angel writing in a book of gold.
Exceeding peace had made Ben Adhem bold,
And to the presence in the room he said:

'What writest thou?' The vision raised its head
And with a look made all of sweet accord,

Answered, 'The names of those who love the Lord.'
'And is mine one?' said Abou. 'Nay, not so',
Replied the angel. Abou spoke more low,
But cheerly still, and said, 'I pray thee, then,
Write me as one who loves his fellow men.'

The angel wrote, and vanished, The next night
It came again, with a great wakening light,
And showed the names whom love of God had blest,
And lo! Ben Adhem's name led all the rest.

ہمارے ہاں تصوف اللہ کی محبت کیلئے اللہ کی کائنات وانسانیت سے تعلق بڑھانے کی بجائے ترکِ دنیا کا سبق دینے لگا۔ حالانکہ اصل تصوف دنیا کے بے اعتدالانہ استعمال کے ترک کی تعلیم دیتا تھا۔ اس غلط تصوف کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم دنیا پر اضمحلال طاری ہونے گا۔ اقبال کے بقول مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سقوطِ بغداد کے بعد غلط تصوف کا حصہ ہے۔

جس زمانے میں مغرب میں علوم فطرت سے ترقی ہورہی تھی ہم لذتِ سکر میں رہتے رہے۔ ہم مجموعی طور پر عالمی عمل سے بیگانہ رہے۔ ہمارے تصوف نے کائنات میں غور وفکر کی بجائے خواب اور کشف پر زور دیا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ صوفیوں نے براہ راست لوگوں سے کہا کہ تم سائنس سے دور رہو بلکہ غلط صوفیانہ تصورات سے ہمارے اندر جو مزاج پیدا ہوا وہ غیر سائنسی تھا بلکہ ضدِ سائنس تھا۔ سائنس انسان کو خارجی مظاہر قدرت کی طرف مائل کرتی ہے۔ ہم نے ساری توانائیاں باطن کی طرف موڑ دیں اور باطن کا سفر کہیں ختم نہ کیا یہ بھی ممکن تھا کہ کچھ سفر طے کر کے باہر کی طرف رخ کر لیتے اور تسخیر ذات کے بعد تسخیر کائنات میں لگ جاتے۔

جس زمانے میں ہمارے ہاں سب سے بڑے صوفی پیدا ہوئے۔ یورپ میں اعلیٰ پائے کے سائنسدان پیدا ہوئے۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| جلال الدین رومی | (1273ء) | راجر بیکن | (1294ء) |
| شیخ احمد سرہندی | (1624ء) | کیپلر | (1630ء) |
| بہاءالدین نقشبندی | (1739ء) | نیوٹن | (1727ء) |
| مہاجر مکی | (1899ء) | ڈارون | (1882ء) |
| سید احمد شہید | (1831ء) | جمیز واٹ | (1819ء) |
| اشرف علی تھانوی | (1943ء) | آئنسٹائن | (1955) |

ہمارے یہ صوفیاء کرام عظیم لوگ تھے انہوں نے انسان کی اخلاقی ترقی میں بہت اہم کردار ادا کیا لیکن اچھا ہوتا کہ ان کے ساتھ ساتھ عظیم پائے کے سائنسدان بھی پیدا ہوتے جو انسانی علم کو آگے بڑھاتے۔ انسان کی روحانی ترقی کے ساتھ ساتھ مادی فلاح کا بھی مداوا کرتے۔

یونان کی اشراقیت (Plotinus) اور ہندو رہبانیت کے زیر اثر تصوف نے ایک فکر و عمل کا گورکھ دھندا بنالیا جو بہت حد تک اسلام کی سادہ روحانی تعلیمات سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ دین و دنیا اور روح و مادہ کے اس حسین توازن کے خلاف تھا جو اسلام کا مقصود تھا۔

میری رائے میں ان غلط تعلیمات کے دو بہت بڑے نقصان ہوئے۔ ایک تو اسلام متحرک و عملی دین کی بجائے چلہ کشی و مردم بیزاری کی طرف چلا گیا۔ دین کی سماجی، سیاسی و معاشی تعلیمات کو پسِ پشت ڈال دیا گیا۔ خدا کی ذات کی بجائے شیخ کی طرف بلایا جانے لگا۔ دین کی عطا کردہ اجتماعت کی بجائے ذاتی عرفان، کشف، مراقبہ جیسے انفرادی اعمال کئے جانے

لگے۔ دین نے تو عبادت ودعا کو بھی اجتماعی عمل بنایا تھا۔ ہم نے اس کو حجرہ تک بلکہ جنگلوں تک محدود کر دیا اس سے سماج ٹوٹنے لگا۔ اجتماعیت کمزور پڑ گئی۔ روحانیت ذاتی فعل بن گیا۔ اس کی اجتماعیت ختم ہوگئی۔ اجتماعیت کی قوت نہ ہونے کی وجہ سے روحانی ونفسی مسائل بڑھنے لگے۔ عبادت کا مقصد اس وقت صحیح طور پر پورا ہوتا ہے جب اس کو اجتماعی طور پر کیا جائے۔ اس لئے اسلام نے نماز باجماعت، جمعہ کی نماز، عیدین اور سالانہ حج پر زور دیا ہے۔

اقبال نے صحیح کہا ہے کہ عبادت اجتماعی شکل میں زیادہ بہتر نتائج دیتی ہے۔ اصل عبادت ایک سماجی عمل ہے۔ اسلام انفرادی نماز کی بجائے نماز باجماعت اور سالانہ حج پر اس لئے زور دیتا ہے کہ عبادت ایک عالمگیر عمل بنتا جائے۔

The real object of prayer, however, is better achieved when the act of prayer becomes congregational. The spirit of all true prayer is social.

With Islam, however, this socialization of spiritual illumination through associative prayer is a special point of interest. As we pass from the daily congregational prayer to the annual ceremony round the central mosque of Mecca, you can easily see how the Islamic institution of worship gradually enlarges the sphere of human association.(Iqbal P-84)

انفرادی سطح پر عجیب وغریب نفسیاتی مسائل سامنے آنے لگے۔مست ملنگ ننگ دھڑنگ ولایت کا دعویٰ کرنے لگے۔لوگ انہیں غیر معمولی قوتوں کا حامل سمجھنے لگے۔جذب وکیف(Spiritual Intoxication) میں صوفی لوگ عجیب وغریب ارشادات فرمانے لگے زندگی کے عملی حقائق سے کٹ کر ذاتی عمودی(Vertical) ترقی کے غلط تصور میں پڑ گئے۔ حضرت عبدالقدوس گنگوہی کا قول قابلِ توجہ ہے کہ

محمد بر فلک الا فلاک رفت و باز آمد
باخدا گرمن رفتمے، ہر گز نیا مدے

(محمد ﷺ معراج میں آسمانوں پر گئے اور واپس آ گئے۔خدا کی قسم اگر میں وہاں جاتا تو ہرگز واپس نہ آتا)اقبال کے بقول یہی فرق ہے صوفی کے شعور میں اور نبی کے شعور میں۔صوفی روحانی تجربے(Unitary Experiance) کے بعد پھر عام حالت میں واپس نہیں آنا چاہتا۔مگر نبی واپس آتے ہیں اور انسانیت کیلئے فلاح لاتے ہیں۔وہ اس تجربے سے واپس آ کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں کرتے ہیں اور فکر ونظر کی ایک نئی دنیا تخلیق کرتے ہیں۔صوفی کیلئے روحانی تجربہ اس کی معراج ہے۔انتہا ہے۔نبی کیلئے صرف ایک سیکھنے کا عمل ہے۔بیداری کا عمل ہے۔

Muhammad of Arabia ascended the highest Heaven and returned. I swear by God that if I had reached that point, I should never have returned.' These are the words of a great Muslim saint, Abd al-Quddus of Gangoh. In the whole range of Sufi literature it will be probably difficult

to find words which, in a single sentence, disclose such an acute perception of the psychological difference between the prophetic and the mystic types of consciousness. The mystic does not wish to return from the repose of 'unitary experience'; and even when he does return, as he must, his return does not mean much for mankind at large. The prophet's return is creative. He returns to forces of history, and thereby to create a fresh world of ideals. For the mystic the repose of 'unitary experience' is something final; for the prophet it is the awakening, within him, of world-shaking psychological forces, calculated to completely transform the human world. The desire to see his religious experience transformed into a living world-force is supreme in the prophet. (Iqbal P-111)

ہمارے ہاں صوفیاء عام طور پر روحانی تجربے میں غائب ہوگئے۔ بہت کم لوگوں نے نبوت کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس دنیا میں واپس آ کر تخلیق و تعمیر کی۔ ان کی عمودی ترقی سے انسانیت کو عمومی طور پر فائدہ نہ ہوا۔ وہ اپنی عمودی ترقی کو افق اثر (Horizental Effect) نہ دے سکے۔ اس لئے انسانی صلاحیتوں کا تاریک غار (Black Hole) بن گئے۔ معتزلہ کی غیر ضروری عقلیت کے جواب میں ہم نے صوفیت کے وجدان کو لا کھڑا کیا جس سے ایک غیر عقلی اور توہماتی رویّے نے جنم لیا۔

عقل علم کا واحد ذریعہ نہ تھا لیکن وحی کے ساتھ ساتھ عقل لازم ہے۔وحی بھی عقل کو خطاب کرتی ہے۔ہم نے عقلیت کے خلاف روحانی تجربے کو لا کھڑا کیا۔کشف، الہام اور وجدان کو علم کا اصل ذریعہ سمجھ لیا۔عقل اور علم کے خلاف باتیں کرنے لگے۔صوفیا نے جو بات ایک خاص انداز میں ایک خاص وجہ سے کہی وہ ہم نے عمومی اصول بنالیا۔عطار نے کہا

صد ورق و صد کتاب را در نار کن

روئے دل را جانبِ دلدار کن

(سینکڑوں صفحے اور سینکڑوں کتابیں آگ میں ڈال دیں اور اپنے دل کا رخ اپنے محبوب کی طرف کرلیں)

اس طرح کی عارفانہ گفتگو سے ہم نے غلط نتیجہ نکالا۔ہم نے ایک غیر عقلی (Anti-Intellectual) رویہ اپنالیا۔علم سے دور رہنے لگے جس کے نتیجے میں تصوف نے ایک غیر علمی اور غیر عقلی شکل اختیار کرلی جس کے سبب کم علم صوفیا غیر اسلامی نظریات کا شکار ہو گئے۔وہ جاہلیت کے حملوں کو نہ سمجھ سکے۔رام اور رحیم کو، کرما اور کریم کو ایک سمجھنے لگے۔

اس صوفیانہ سوچ سے ایک بہت بڑا نقصان ذات کی نفی (Negation of Self) کی صورت میں سامنے آیا جس سے شخصی آزادی اور ارتقاء رک گیا۔صوفی نے اپنی ذات کو شیخ میں فنا (فنافی الشیخ) کرنا تھا۔پھر نبی پاکؐ کی ذات میں فنا (فنافی الرسول) اور پھر خدا کی ذات میں فنا (فنافی اللہ) کرنا تھا۔اس نفسیاتی سوچ نے وحدت الوجود (Pantheism) کو جنم دیا کہ آپ اللہ کی ذات کا حصہ بن جائیں گے۔حضرت مجدد الف ثانی نے اس فنا کی سوچ کے مضمرات کو سمجھا۔اس فنا کے بعد بقا کو اپنایا۔خدا کی ذات میں اپنی ذات کو گم کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔خدا کے رحم وکرم پر ہوتے ہوئے اپنی ذات کا تشخص قائم رکھا۔ذات کا یہ قیام

(Affirmation) انسانی ترقی کا بنیادی لازمہ ہیں۔ جب تک انسان اپنی ذات کو آگے نہیں لائے گا۔ وہ کوئی بھی تخلیقی عمل نہیں کرسکتا۔ یہی ہمارے ساتھ ہوا۔ بڑے بڑے ذہن تصوف کی اس غلط تعبیر کی نذر ہو گئے۔ حیوانی صفات کو ضبط کرنے کی بجائے ان کو فنا کرنے پر تل گئے۔ غیر ضروری عاجزی نے اعتمادِ ذات ہی ختم کر دیا۔ خودی میں ڈوب کر باہر نہ نکل سکے۔

یہ ذکرِ نیم شبی ، یہ مراقبے ، یہ سرور
تیری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہم اپنی ذات میں اعتماد کی بجائے فنافی مرشد میں (فنا الشیخ) کے چکر میں پڑ گئے۔ قرآن نے آسمان و زمین کی طرف بلایا تھا۔ ہم نے کہا کہ شیخ کی اطاعت کرو۔

بامئے سجادہ رنگین کن اگر پیر مغان گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

(اگر پیر صاحب کہیں تو پیالہ شراب سے بھر لو اس لئے کہ شیخ صاحب کو منزل کے راستوں کا عرفان حاصل ہوتا ہے)

اس نظامِ فکر سے غیر صحتمندانہ شخصی تقدس اور شخصیت پرستی نے جنم لیا جو بذاتِ خود تحقیق و تعلیم کی دشمنی ہے۔ یہ سوچ جب آگے بڑھی تو اس نے نعرہ لگایا کہ ولایت نبوت سے بہتر ہے۔ ولی (پیر) نبی سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا جو سراسر غیر اسلامی سوچ تھی۔

تقویٰ کے نام پر ہم نے اللہ کی عطا کردہ جائز نعمتیں بھی اپنے اوپر حرام کر لیں۔ نبی اکرم ﷺ نے ایک بار ایک معمولی وجہ سے ارادہ فرمایا کہ آپؐ آئندہ شہد نہیں کھائیں گے۔ اس ارادہ پر اللہ پاک نے ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ ہم نے اب بہت سی نعمتیں نبی پاکؐ کی غلامی کے نام پر اپنے لئے ترک کر لی ہیں۔

میرے ایک پیارے دوست نے ایک بار مجھے پورے اعتماد میں لیکر بتایا کہ ان کے پیرصاحب بہت عبادت گزار تھے۔ انہوں نے ایک ٹہنی پکڑ کر کئی سال ایک ٹانگ پر عبادت کی۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں نے عرض کیا کہ یہ نبی کریم کی سنت نہیں ہے۔ آپ آرام بھی فرماتے تھے۔ کام بھی کرتے تھے۔ آپؐ نے ساری رات عبادت سے منع فرمایا ہے۔ سارے سال روزے رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ تو کیا ہمارے پیرصاحبان اللہ کے نبی سے زیادہ نیک ہیں۔ بلکہ یہ رویّہ سراسر غلط ہے جو اسلام میں سخت ناپسندیدہ ہے۔ آقائے نامدار نے تو اعتدال کا سبق دیا ہے۔

اس ''عبادت گزاری'' سے مجھے یاد آیا کہ سینٹ میکیر لیس چھ ماہ تک ایک دلدل میں رہتا رہا اور عام طور پر ایک من لوہے کا وزن اپنے گلے میں رکھتا تھا۔ ہمارے بھی ملنگ یہی کرتے ہیں۔ زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں۔ سینٹ یوسیس تین سال تک ایک خشک کنویں میں مقیم رہے۔ مشہور راحب یوحنا مسلسل تین سال تک کھڑے ہو کر عبادت کرتے رہے، سونے کیلئے بس ایک چٹان پر لیٹ جاتے، سینٹ انھونی نے کبھی پیر دھونے کا گناہ نہیں کیا تھا۔ سینٹ ابراہم نے پچاس سال میں کبھی اپنا منہ نہیں دھویا۔ سبحان اللہ کیا تقویٰ تھا۔ یہ روایت عیسائیت میں تو ممکن ہو سکتی ہو گی مگر اسلام میں ممکن نہیں ہے۔ (ندوی 212 بحوالہ تاریخ اخلاقِ یورپ۔ لیکی)

ہمیں اس تصوف کو غیر اسلامی اور غیر انسانی نظریات سے پاک کرنا ہو گا۔ روحانیت اللہ کی ذاتِ عالی کی حضوری اور نبی اکرم کی غلامی کا نام ہے۔ ہمیں نبوی مزاج اپنا ہو گا۔ انسانوں میں رہتے ہوئے اعلیٰ اخلاق و روحانی واردات رکھتے ہوئے عمومی فلاح کیلئے کام کرنا ہو گا روحانی تجربے اور نفسیاتی بیماریوں میں فرق کرنا ہو گا۔ انسانیت سے محبت کرنا ہو گی۔ عاجزی پیدا کرنا ہو گی۔ دین کی اشاعت کیلئے اپنے آپ کو گھولنا ہو گا۔ اجتماعیت میں انفرادیت ڈھونڈنا ہو گی۔ نیلے پیلے رنگوں اور نفسیاتی خوابوں سے نجات پانا ہو گی۔ طریقت کو شریعت کے تابع کرنا ہو گا۔

یہ حکمتِ ملکوتی ، یہ علمِ لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

### (x) جہاد کا صحیح تصور

عہدِ حاضر کے سیاسی تناظر میں جہاد سے کیا مراد ہے۔کن کن حالات میں ہمارے نوجوان بندوق اٹھا سکتے ہیں۔کیا اس کی کوئی شرائط بھی ہیں؟ کیا جہاد صرف اسلحہ سے ہوتا ہے؟ کن حالات میں اسلحہ سے جہاد مناسب نہیں ہے کیا مسلمانوں کے ایک فرقے کا دوسرے فرقے سے برسرِ پیکار ہونا بھی جہاد ہے۔کن حالات میں جہاد فرض عین (سب مسلمانوں پر فرض) ہے۔کب یہ صرف فرضِ کفایہ (چند لوگوں پر یا مقامی لوگوں پر فرض) ہے؟ ہمارا بہت خون بہہ چکا ہے۔جوانیاں لٹ گئی ہیں۔اب اس پر غور کی ضرورت ہے۔

نبی پاکؐ جو انقلاب لائے۔اس میں 23 سال لگے۔کم وبیش 81 چھوٹے بڑے معرکے ہوئے 27 میں آپ خود شریک ہوئے۔ان 23 سالوں میں 259 مسلمان شہید ہوئے۔اور 759 غیر مسلم قتل ہوئے۔یعنی کہ کل 1018 قتل ہوئے۔یہ تاریخ کا عظیم ترین انقلاب تھا۔خون اتنا کم بہا ہے کہ اسے غیر خونی انقلاب (Bloodless Revolution) کہا جا سکتا ہے۔

آیئے ہم عہدِ حاضر کی اسلامی تحریکوں کو دیکھیں۔الجزائر کے جہاد میں 25 لاکھ مسلمان مارے گئے۔ہندوستان و پاکستان وکشمیر وافغانستان اور چیچنیا میں ہزاروں لوگ قتل ہو گئے۔یہی حال فلسطین،شام،مصر وغیرہ میں ہے۔میری اس بات کا یہ مطلب بالکل نہیں ہے کہ میں جہاد کے تصور کے خلاف ہوں۔میں اتنی گزارش کر رہا ہوں کہ ہمیں جہاد کا مفہوم متعین کرنا چاہیے۔

اس کی اقسام اور حکمت عملی متعین کرنی چاہیے۔ وگرنہ خون بہتا رہے گا کوئی قابلِ قدر فائدہ نہ ہوگا۔ فیض صاحب نے غالباً ہمارے لئے کہا ہے۔

نہ کوئی مدعی نہ کوئی منصف، حساب پاک ہوا
خون غریبان تھا، رزقِ خاک ہوا

جہاد کی کئی قسمیں ہیں علمی جہاد، دعوتی جہاد، قتال وغیرہ۔ سورۃ الحج میں ارشاد ہے۔

اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ (آیت 78)

اس آیت کی تفسیر میں مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ جہاد سے مراد محض قتال (جنگ) نہیں ہے بلکہ یہ لفظ جہد وجہد اور کشمکش اور انتہائی سعی و کوشش کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ (تفہیم القرآن جلد سوئم صفحہ 253) ثناء اللہ پانی پتی کی رائے میں جہاد سے مراد جد وجہد اور وسعت وطاقت ہے۔ (تفسیر مظہری جلد ہشتم صفحہ 106)

سورۃ الفرقان میں ارشاد ہے۔

'اے نبی آپ کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ جہادِ کبیر کرو' (آیت 52)

جہاد کبیر کے تین معنی ہیں، ایک انتہائی کوشش جس میں آدمی سعی و جان فشانی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔ دوسرے بڑے پیمانے پر جد وجہد جس میں آدمی اپنے تمام ذرائع لاکر ڈال دے، تیسرے جامع جد وجہد جس میں آدمی کوشش کا کوئی پہلو اور مقابلے کا کوئی محاذ نہ چھوڑے۔ (تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ 457)۔ جہادِ عظیم سے مراد دل سے، زبان سے اور تلوار سے جہاد ہے (تفسیر مظہری جلد ہشتم صفحہ 318۔ ضیاء القرآن جلد سوم صفحہ 369)۔

نبی کریمؐ جب تبوک سے واپس تشریف لا رہے تھے۔(ذہن میں رہے کہ یہ وہ واحد جنگ ہے جس کی نبیؐ نے علی الاعلان تیاری کروائی اور اس جنگ میں اسلامی مملکت کے وجود کو شدید خطرہ تھا۔صحابہ کرام شاندار قربانی کر کے اپنی پکی فصلیں چھوڑ کر اس غزوہ میں گئے تھے) آپؐ نے ارشاد فرمایا۔

رجعنامن الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر

(ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ رہے ہیں)

آپؐ نے اپنے زمانہ امن کی دعوتی سرگرمیوں کو یہاں جہادِ اکبر کہا ہے۔حضرت جابر نے روایت کیا ہے کہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں کچھ غازی لوگ حاضر ہوئے،آپؐ نے ان کو خوش آمدید کہا اور فرمایا کہ تم لوگ چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ آئے۔ (تفسیر مظہری جلد ہشتم صفحہ 107) عرض کیا یا رسول اللہؐ! بڑا جہاد کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا آدمی کی خود اپنی خواہشِ نفس کے خلاف جدوجہد۔(تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ 254)

جہاد کی ایک شکل قتال (جنگ) ہے۔جو بعض اوقات سب سے افضل قسم بھی بن جاتی ہے۔1979ء میں سوویت یونین نے افغانستان پر قبضہ کرلیا اور اشتراکی لادینی نظام ٹینکوں کے زور سے نافذ کرنے کی کوشش کی تو مسلمانوں کا اجماع تھا کہ یہ جہاد ہے۔بہرحال یہ جہاد کی ایک شکل تھی۔جہاد صرف اسی کا نام نہیں ہے۔

جہاد کا ایک تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان اسلام سے بخوبی واقف ہو جس کی خاطر وہ جہاد کر رہا ہے اور کفر و جاہلیت کو جانتا ہو جس کے خلاف وہ جہاد کر رہا ہے۔تاکہ کفر جس رنگ میں بھی ظاہر ہو اس کی معرفت ہو سکے۔حضرت عمر کا قول ہے۔

مجھے خطرہ ہے کہ وہ شخص اسلام کی کڑیاں بکھیر دیگا جس نے اسلام
میں نشوونما پائی مگر وہ جاہلیت کو نہیں پہنچانتا (ندوی۔صفحہ 162)

لگتا ہے حضرت عمر نے آجکل کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا ہے۔ ہم نے جہاد کو بدنام کردیا ہے۔ اس کو بے ہودہ (Vulgarize) کردیا ہے۔ اہل اقتدار کبھی اپنے مفاد میں اور کبھی آقاؤں کے اشاروں پر جہاد جہاد کرتے ہیں اور کبھی پھر اپنے مفاد میں اور کسی اور کے اشارے پر اس کو دہشت گردی سمجھتے ہیں۔ یہ مذاق اب بند ہونا چاہیے۔ اہل اقتدار کو تو ڈالر ملتے ہیں۔ خون تو مخلص نوجوانوں کا ہوتا ہے۔ ان کی مائیں رورو کر اپنی آنکھوں کے آنسو خشک کر لیتی ہیں نوجوان دلہنوں کے سہاگ لٹ جاتے ہیں اور ہمارا کھیل ہوجاتا ہے۔ مجھے شکسپیر کا ایک مصرع یاد آرہا ہے۔ تھوڑی تبدیلی کے ساتھ درج کرتا ہوں۔

As flies to the wanton boys: We are to the gods

They kill us for their sports

### (xi) اجتہاد کی ضرورت

انسانی زندگی میں ثبات وتغیر لازم ہے۔ کچھ ایسے اصول چاہیں جو مستحکم ہوں۔ پائیدار ہوں جن پر تبدیلی کا عمل نہ ہو سکے۔ قرآن کی اصطلاح میں انہیں محکمات کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور توحید، رسالت، آخرت، شرف انسانی وغیرہ۔ ان محکمات کے ساتھ تہذیب انسانی کو کچھ تغیرات چاہیے ہوتے ہیں تاکہ ہر زمانہ میں زندہ رہا جا سکے۔ تہذیب انسانی کی سماجی ومعاشی اور علمی ترقی کا ساتھ دینے کیلئے اسلام نے اجتہاد کا تصور دیا ہے۔ اجتہاد سے مراد نیا دین نہیں ہے بلکہ دین کے ابدی اصولوں کی عہدی تعبیر ہے۔ اجتہاد ایک محض فنی مسئلہ نہیں ہے بلکہ انسانی ضرورت ہے۔ حالات کا تقاضا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر پہلے تجارت کشتیوں پر ہوتی تھی اب بحری جہازوں، ہوائی جہازوں، بنکوں اور انٹرنیٹ کے ذریعے ہوتی ہے۔ تجارت کے بنیادی اصول (سچائی، دیانت داری، جائز منافع، عدم استحصال، ملکیت کی حفاظت، اخلاق کی حفاظت، وعدہ کی پابندی وغیرہ) تو وہی رہیں گے لیکن ان جدید ذرائع تجارت میں نئی

تعبیر (Interpretation) اور تطبیق (re-application) ہوگی۔ اس لئے کہ انسان کشتی کے دور کی تجارت سے نکل کر ای کامرس (E-Commerce) میں داخل ہو چکا ہے۔

علامہ الشاطبی نے اپنی مشہور کتاب الموافقات (جلد چہارم) میں تحریر کیا ہے کہ اجتہاد کی ضرورت قیامت تک رہے گی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ انسان نے آخر دم تک شریعت پر عمل کرنا ہے۔ جبکہ شریعت صرف بنیادی اصول فراہم کرتی ہے۔ اور زندگی کی تفصیلات زمانے کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے شریعت کے بنیادی اصولوں کی نئے حالات میں تشریح وتطبیق کیلئے اجتہاد کرنا پڑے گا۔

اجتہاد کے لفظ کا ماخذ جہد ہے جس کا مطلب کوشش کرنا ہے۔ اجتہاد کا مطلب زیادہ کوشش کرنا ہے۔ پوری صلاحیت استعمال کرنا ہے۔ مذہبی اصطلاح میں اس کا مفہوم ہے کہ اپنی پوری کوشش کر کے کسی نئے معاملے میں دین کے اصولوں کی روشنی میں اپنی رائے بنانا۔

اجتہاد کی دو قسمیں ہیں جزوی (Partial) اجتہاد اور کلی (Total) اجتہاد، جزوی اجتہاد سے مراد ہے کہ کسی ایک فروعی حکم میں دین کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں اپنی رائے بنانا۔ اس کی ایک مثال غزوہ خندق میں پیش آئی۔ جنگِ خندق سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے ایک گروہ کو حکم دیا کہ وہ بنی قریظہ کی بستی میں جائیں اور وہاں جا کر عصر کی نماز پڑھیں وہ لوگ روانہ ہو گئے۔ راستہ میں عصر کی نماز کا وقت آ گیا۔ وہ جماعت دو حصوں میں بٹ گئی۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم راستے میں نماز نہیں پڑھیں گے بلکہ منزل پر پہنچ کر پڑھیں گے اسلئے کہ نبی پاکؐ کے الفاظ یہ تھے کہ بنی قریظہ میں جا کر نماز پڑھیں۔ اس کے برعکس کچھ دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ نماز میں تاخیر ہو رہی ہے۔ راستے میں نماز پڑھ لی جائے اور آپؐ نے جو حکم دیا تھا اس کا اصل مطلب یہ تھا کہ جلد از جلد منزل پر پہنچا جائے۔ تاخیر نہ کی جائے۔ نبی کریمؐ نے دونوں گروہوں کی رائے کو منظور فرمایا۔

کلی اجتہاد سے مراد ہے کہ کسی صورت حال میں عام فکر سے اوپر اٹھ کر دین کے وسیع تر مفاد میں رائے قائم کی جائے۔آنجنابؐ کے عہد میں صلحِ حدیبیہ اس کی عمدہ مثال ہے (نبی وحی کی روشنی میں کام کرتے ہیں نبی کا عمل سنت کہلاتا ہے جو اجتہاد کا ماخذ ہے۔اسلئے یہاں سیرتِ پاک کی مثالوں کو وسیع تر تناظر میں دیکھنا چاہیے) یہ معاہدہ آپ نے یک طرفہ شرائط پر کیا۔عمرہ چھوڑ دیا۔محمد رسول اللہ کا لفظ مٹادیا ابوجندل جیسے زخمی مظلوم کو واپس بھیج دیا سب صحابہ کرام ناخوش تھے۔حضرتِ عمرؓ نے آپؐ سے گلہ کیا کہ ایسی شرائط پر تو معاہدے ہم نے دورِ جاہلیت اور کمزوری کے وقت بھی نہیں کئے تھے۔اب تو ہمارے پاس ہدایت ہے اور قوت ہے۔مگر آنجنابؐ نے وقتی مصلحتوں اور پریشانیوں سے اوپر اٹھ کر سوچا۔آپ کی نظر حال کی بجائے مستقبل کو دیکھ رہی تھی۔نتیجہ دیکھ لیں۔قرآن نے اس کو فتحِ مبین کہا۔تاریخ نے ثابت کر دیا کہ بظاہر دب کر کی جانے والی صلح اصل میں اسلام کیلئے مفید ثابت ہوئی اور غلبہِ اسلام کا سبب بنی۔

عام طور پر کسی بھی دینی حکم سے کلی اور جزوی اجتہاد کیا جاسکتا ہے۔مثال کے طور پر حضرت صہیب رومی جب کفارِ مکہ کے ظلم سے تنگ آکر مدینہ کی طرف ہجرت کرنے لگے تو قریش کے کچھ لڑکوں نے ان کا راستہ روکا اور دینار چھین لئے۔اب حضرتِ صہیب کے سامنے یقیناً یہ حدیث ہوگی کہ جو شخص اپنی جائیداد کو بچاتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے۔اوران کے سامنے شہادت کے فضائل بھی ہوں گے اور وہ تھے بھی باہمت انسان،لیکن انہوں نے قریش کے ان لڑکوں سے لڑنا پسند نہ کیا۔شہادت کو چھوڑ دیا۔بلکہ اسلام کے وسیع تر مفاد میں اپنے دینار لڑکوں کے حوالے کر دیئے۔اپنی جان بچا کر مدینہ تشریف لے گئے۔یہ کلی اجتہاد کی ایک شکل تھی۔

ہمیں عہد حاضر میں ایک عمومی اور کلی اجتہاد کی ضرورت ہے جس کے نتیجے میں فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید کی ضرورت ہے۔حضرت علامہ اقبال نے 1929ء میں فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید(The Reconstruction of Religious Thought in Islam) میں اس عظیم کام کو شروع کیا۔ عہدِ حاضر شدید تقاضہ کرتا ہے کہ اس تشکیل جدید کے عمل کو جلدازجلد آگے بڑھایا جائے۔تشکیل جدید کلی اجتہاد سے ہوتی ہے جس کیلئے ہمارے علماء تیار نہیں ہیں۔اس لئے تشکیل جدید کا عمل نہیں ہوسکا۔حالانکہ اجتہاد اسلام میں مطلوب ہے۔لازم ہے۔اجتہاد اتنا مطلوب ہے کہ اجتہادی غلطی پر بھی ثواب ملتا ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت عمرو بن العاصؓ نے روایت کی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی آدمی فیصلہ کرے اور وہ اجتہاد کرے اور اس کا فیصلہ درست ہو تو اس کیلئے دو اجر ہیں۔اگر وہ فیصلہ کرے اور اجتہاد کرے پھر وہ غلطی کر جائے تو اس کیلئے ایک اجر ہے۔علماء نے لکھا ہے کہ پہلے شخص کیلئے دو اجر،کوشش اور درستگی کیلئے ہیں جبکہ دوسرے شخص کو صرف کوشش کا اجر ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ اجتہاد اتنا پسندیدہ عمل ہے کہ اس میں غلطی کرنے پر بھی ثواب ہے۔بشرطیکہ انسان کی نیت درست ہو،اس سے اصول طے ہوگیا کہ اجتہاد ہر حال میں جاری رہنا چاہیے۔چاہے غلطیاں بھی ہوتی رہیں۔اب ہم نے اجتہاد ختم کر دیا ہے کہ کہیں غلطی نہ ہوجائے۔یہ اسلام کی تعلیم اور وقت کے تقاضوں کے خلاف ہے۔اس لئے ہم پر جمود طاری ہے۔ذلت مقدر ہے۔

اجتہاد ایک لازم مگر نازک مسئلہ ہے۔ ہر آدمی اس کا اہل نہیں ہوسکتا۔صاحبِ اجتہاد کیلئے شرائط کا ہونا لازم ہیں۔اس لئے اسلام میں اس کی کئی شرائط ہیں۔مثلاً

☆ عربی زبان کا عالم ہونا

☆ قرآن کا عالم ہونا

☆ حدیث کا عالم ہونا
☆ عظیم فقہا کی آراء سے واقف ہونا
☆ اصولِ تفسیر، اصولِ حدیث اور اصولِ فقہہ سے واقف ہونا
☆ دین کی روح سے واقف ہونا، شریعت کے مقاصد سے واقف ہونا
☆ احکامِ دین پر عمل کرنا وغیرہ وغیرہ

ان معیارات کو اگر ہم دیکھیں تو ہمیں اپنے اردگرد بہت سے علماء نظر آئیں گے جو ان شرائط پر پورا اترتے ہیں لیکن پھر بھی اجتہاد کا عمل جاری نہیں ہے۔ اس کا ایک سبب شخصیت پرستی (Personality Cult) ہے۔ ہم علمی تنقید و جرح کو برا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اوّل اسلام میں ایسا نہ تھا۔ اوّل فقہہ میں ایسا نہ تھا۔ امام ابوحنیفہ کے شاگردوں نے 85% معاملات میں اپنے استاد سے اختلاف کیا۔ (ڈاکٹر حمید اللہ صفحہ 92)

ہمارے نزدیک تنقید یا اختلاف رائے ایک (Taboo) کی حیثیت لکھتا ہے۔ مجھے ولایت میں حیرانی ہوئی کہ جب وہاں ہمیں مقدمات کی نظائر (Precedents) پڑھا رہے ہوتے تھے تو عام جونیئر اساتذہ بھی برطانیہ کی اعلیٰ ترین عدالت (House of Lords) کے فیصلوں پر بہت بے رحمی سے تنقید کرتے۔ اس کی خوبیاں اور خامیاں بیان کرتے۔ سچ تو یہ ہے کہ جدید نظام تعلیم میں جرح و تنقید کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ بڑوں کے نظریات پر تنقید بالکل عام ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں میں ناقدانہ فکر (Critical Thinking) پائی جاتی ہے جس کے سبب وہاں ہر لمحے علم ترقی کرتا رہتا ہے۔

وہاں بدلتا ہے لحظہ لحظہ، یہاں بدلتا نہیں زمانہ

ہم نے اپنے بڑوں کے گرد تقدیس کے ہالے بنالئے ہیں۔ ذرا سا اختلاف بھی ان کی توہین ہے اور گردن زدنی ہے۔ حالانکہ اختلاف اور احترام دو مختلف چیزیں ہیں۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ صلح حدیبیہ اور جنگ حنین کے موقع پر اکثر صحابہ کرام نے آپ ﷺ سے شدید اختلاف کیا تھا؟ خلافتِ راشدہ کے دور میں اس کئی مثالیں ملتی ہیں۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ امام یوسف اور امام محمد نے امام ابوحنیفہ سے اکثر معاملات پر اختلاف کیا ہے۔ آپ دیکھیں کہ احترام ومحبت بھی برقرار رہی اور اختلاف بھی ہوا۔ اس لئے ہمیں یہ رٹ چھوڑ دینی چاہیے کہ فقہہ کے چار مسلمہ مکاتب فکر (حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ) کے علاوہ کوئی رائے نہیں ہوسکتی۔ دوسری رائے ہوسکتی ہے قدیم وجدید علماء کی ایک کثیر اور قابل احترام جماعت اس کی حامی ہے۔ عبدالسلام (1262ء) علامہ بحرالعلوم حنفی، امام شوکانی (1834ء) اشرف علی تھانوی (1943ء)، شیخ مصطفیٰ المراغی (1945ء) اس صف میں شامل ہیں۔

ہمارے ہاں کلی اجتہاد کی ایک بہت اچھی کوشش شاہ ولی اللہ (1762ء) نے کی۔ شاہ صاحب نے اسلام کی اجتماعی ہیئت اور عدلِ اجتماعی پر بہت زور دیا۔ جہادی تحریک (1831ء) علماء دیوبند، جامعہ ملیہ، ندوۃ العلماء، جماعتِ اسلامی، جمیعت العماء ہند، علامہ شبلی نعمانی، سرسید، اقبال، سب کسی نہ کسی درجہ میں شاہ صاحب سے متاثر ہیں۔ لیکن نہایت ادب سے کہنا چاہتا ہوں کہ شاہ صاحب بھی عہدِ حاضر کے تمام فتنوں کا صحیح ادراک نہ کرسکے۔ شاہ صاحب کے زمانے میں عہدِ حاضر کے نئے مسائل جنم لینے لگے تھے۔ شاہ صاحب ان سے بے خبر رہے۔ ان کیلئے مناسب نہ تھا کہ اپنی کتاب فیوض الحرمین میں لکھتے کہ انہوں نے خواب میں دیکھا ہے کہ وہ قائم الزمان ہیں۔ مسلمانوں کو اس طرح کی نفسی کیفیات سے نکالنے کی ضرورت تھی۔ یہ نفسی وروحانی تجربات ایک فرد کیلئے ٹھیک ہوسکتے ہیں لیکن ان کو امت کے سامنے رکھنا اور ان کی بنیاد پر دین کی

تعبیر کرنا یا اس تعبیر کی صداقت پر دلیل لانا مناسب نہیں ہے۔ ہمیں خالصتاً دینی تعلیمات اور عقل کو معیار بنانا ہے۔ خواب وکشف کا اب زمانہ نہیں رہا۔ یہ ہماری ذات کیلئے مناسب ہوسکتا ہے۔ یہ شخصی تجربہ تو ٹھیک ہے لیکن اسے اجتماعی تجربہ بنانا نقصان دہ ہے۔

شاہ صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ امام شافعی (820ء) کے بعد کوئی مجتہد مطلق پیدا نہیں ہوسکتا۔ (فکرِ اسلامی صفحہ 53) یعنی کہ اب کلی اجتہاد نہیں ہوسکتا۔ نہایت ادب سے گزارش ہے کہ زمانہ امام شافعی کے ساتھ رک نہیں گیا بلکہ رواں دواں ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اب یکسر بدل گیا ہے بلکہ اس انٹرنیٹ کے زمانے میں زمانہ ہر دس سال میں بدل رہا ہے۔ ہم امام شافعی سے مطلقاً محبت کرتے ہوئے بھی ان کے زمانے میں نہیں رہ سکتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ نئے اصول بنائے جائیں لیکن اتنا ضرور کہتا ہوں کہ اعلیٰ اصولوں کی نئی تعبیر اور تطبیق (Re-application) نہایت لازم ہے۔

شاہ صاحب کے زمانے میں یورپ میں مسلمانوں کے زیر اثر نشاۃ ثانیہ شروع ہوچکی تھی بلکہ صنعتی انقلاب شروع ہو رہا تھا۔ یورپی تاجر، مشنری، سیاح، سائنسدان اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ 1639ء میں مدراس اور 1661ء میں انگریزوں نے بمبئی پر قبضہ کرلیا تھا۔ ہندوستان کے اکثر ساحلی علاقے یورپ کی نئی سائنس وسماجی طاقت کے سبب انگریزوں کے قبضے میں آ گئے تھے۔ شاہ صاحب نے ان کی طرف توجہ نہ کی۔

شاہ صاحب نے تفصیل کے ساتھ جہاد وقتال کے اصول ومسائل بیان کئے ہیں لیکن دعوت وتبلیغ پر زیادہ توجہ نہ دی۔ ان کی کتب دین کے اس اہم پہلو پر زیادہ تر خاموش ہیں۔ مسلمانوں میں حربی (militant) سوچ رہی ہے جبکہ دین زیادہ تر دعوتی سوچ کا نتیجہ ہے اور اسی سے قائم ہے۔ اور اسی سے قائم رہے گا۔ سید احمد شہید (1831ء) کی تحریک سے لیکر اخوان

وطالبان تک کی تاریخ گواہ ہے کہ ان تحریکوں کے پاک باز نوجوان بھی اپنی جوانیاں لٹا کر اسلام کو غلبہ نہ دے سکے۔ غالبًا اسی لئے کہ اسلام میں تلوار سے زیادہ قلم کی اہمیت ہے۔ دین اقراء سے شروع ہوا ہے۔ سیف سے شروع نہیں ہوا۔ اسلئے نتیجہ صاف ظاہر ہے۔

شاہ صاحب سے پہلے گیلیلیو (1642ء) اور نیوٹن (1727ء) سائنس میں انقلاب لا چکے تھے۔ شاہ صاحب اس سائنسی فکر سے بے خبر رہے حتیٰ کہ شاہ صاحب کی معرکتہ الآ راء کتاب حجۃ البالغہ 1870ء میں پہلی بار چھپ سکی جبکہ یورپ میں چار سو سال پہلے کتابیں چھپ رہی تھیں (اسلامی فکر صفحہ 175)۔ میں شاہ صاحب کا بہت معترف ہوں۔ انہوں نے قرآن کا فارسی میں ترجمہ کر کے ہندوستان میں دین کی تفہیم پیدا کی۔ ان کے مدرسہ رحیمیہ نے دین کی اشاعت میں بہت اہم رول ادا کیا۔ لیکن میری گزارشات کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اور زیادہ کلی اجتہاد کی ضرورت ہے۔ ہمیں ہر وقت کئی شاہ صاحبان کی ضرورت ہے۔ اور عہد حاضر میں بھی شاہ صاحبان کی ضرورت ہے۔ مجھے دکھ یہ ہے کہ یہ سلسلہ آگے کیوں نہیں چلا۔ ہمارے ہاں ابنِ تیمیہ (1328ء) کے بعد شاہ صاحب (1762ء) آئے اور پھر خاموشی رہی جبکہ زمانہ اپنی رفتار اور تیز تر کر رہا ہے۔

اجتہاد سے مراد یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی قیادتِ زندگی کے نئے پیش آنے والے مسائل میں انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر صحیح فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ اسلام کی روح اور اسلام کے قانون سے اتنی گہری واقفیت رکھتے ہوں کہ وہ امت کی مشکلات کو حل کر سکیں۔ وہ عقل اور علم رکھتے ہوں۔ محنت کیلئے تیار ہوں۔ اللہ نے اس وسیع کائنات میں جو قوتیں عطا کی ہیں ان سے کام لے سکیں۔ ان کو اسلام کے مقاصد کیلئے مفید بنا سکیں۔ (ندوی۔ 163)

بد قسمتی سے ہماری صورت حال بالکل اس کے برعکس ہے۔ ہماری قیادت ایک بدترین اشرافیہ (corrut Elite) کے ہاتھوں میں ہے۔ جس کے پاس نہ عقل ہے اور نہ علم، اخلاق ہے اور نہ ایمان، ہے تو فقط زر پرستی اور جاہ پرستی، اگر اسلام انہیں پسند ہے تو ووٹ لینے کیلئے یا اقتدار کوطول دینے کیلئے، ظلم یہ ہے کہ اہل اسلام عام طور پر ایسے لوگوں کی تقویت کا سبب بنتے ہیں۔

سید ابوالحسن علی ندوی تُرکوں کی سلطنت کے زوال کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

سب سے بڑا مرض جو ترکوں میں پیدا ہوا تھا وہ جمود تھا۔ اور جمود بھی دونوں طرح کا۔ علم وتعلیم میں بھی جمود اور فنون جنگ وعسکری تنظیم وترقی میں بھی، قرآن مجید کی یہ آیت انہوں نے بالکل فراموش کردی۔ مسلمانو! جہاں تک تمہارے بس میں ہے قوت پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ کیلئے اپنا ساز وسامان مہیا کئے رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے۔ (انفال۔60) اور آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد ان کے حافظہ سے گویا محو ہو گیا تھا کہ دانائی کی بات مومن کا گم شدہ مال ہے جہاں اس کو مل جاوے وہی اس کا زیادہ حقدار ہے۔

ایسی حالت میں کہ وہ یورپ کی حریف سلطنتوں اور قوموں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ ان کو فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص ؓ کی وہ وصیت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے تھی جو انہوں نے مصر کے مسلمانوں کو کی تھی کہ! اس بات کو کبھی نہ بھولنا کہ تم قیامت تک خطرہ کی حالت میں ہو۔ اور ایک اہم ناکہ پر کھڑے ہوئے ہو۔ اس

لئے تم کو ہمیشہ ہوشیار اور مسلح رہنا چاہیے کیوں کہ تمہارے چاروں طرف دشمن ہیں اور ان کی نگاہیں تم پر اور تمہارے ملک پر لگی ہوئی ہیں۔

علمی جمود اور ذہنی اضمحلال اس وقت صرف ترکی اور اس کے علمی اور دینی حلقوں کی خصوصیت نہیں تھی واقعہ یہ ہے کہ پورا عالم اسلامی مشرق سے مغرب تک ایک علمی انحطاط کا شکار تھا۔ دماغ تھکے تھکے سے اور طبعتیں بجھی بجھی سی نظر آتی تھیں۔ اگر ہم احتیاطاً آٹھویں صدی سے اس ذہنی اضمحلال کی ابتداء نہ کریں تو اس میں شک نہیں کہ نویں صدی ہجری وہ آخری صدی تھی جب جدتِ فکر، قوت اجتہاد اور ادب وشاعری، حکمت وفن میں ندرت اور تخلیق کے آثار نظر آتے ہیں۔ پچھلی صدیوں کے علماء کے تذکرے اور کتب سوانح پڑھیے سینکڑوں ناموں میں ایک ایسے شخص کا ملنا مشکل ہوگا جس پر عبقری (Genius) کے لقب کا اطلاق درست ہو۔ یا جس نے کسی موضوع پر کوئی نئی چیز پیش کی ہو۔ پچھلی صدیوں میں ہم صرف چند افراد کا استثناء کر سکتے ہیں جو اپنے زمانہ کی عام علمی و ذہنی سطح سے بہت بلند تھے۔۔۔ (صفحہ 189)

یہ المناک صورت آج بھی ویسی ہی ہے جو سلطنت عثمانیہ کے بارے میں تھی۔ آج بھی وہی جمود ہے وہی بے خبری ہے۔ آج بھی وہی خطرات ہیں۔ آج بھی وہی تھکاوٹ واضمحلال

ہے۔آج بھی کوئی باہمت مرد نہیں ہے۔ہم نے پانچ سو سال میں کوئی بھی عبقری پیدا نہیں کیا۔ آپ یورپ کی فہرست دیکھیں۔سائنس میں آپ کو کاپرنیکس ، برونو، گلیلیو، کیپلر ، نیوٹن، ڈارون، آئن سٹائن ملتے ہیں۔فلسفہ میں ہیوم، ہیگل، کانٹ، سپائنوزا، بیکن ، والٹیر، شوپنہار، نطشے اور برگسان ملتے ہیں معاشیات میں آدم سمتھ، ریکارڈو، مالتھس ، مارکس اور کینز ملتے ہیں۔ ادب میں ملٹن، شکسپیئر ، ورڈز ورتھ، شیلے، کیٹس ،ٹالسٹائی، وکٹر ہیوگو ملتے ہیں۔نفسیات میں فیرائڈ، ایڈلر، یونگ اور ولیم جیمز ملتے ہیں۔

یہ فہرست بہت طویل ہے۔لندن میں آپ کسی محلے میں چلے جائیں آپ کو ہر گلی میں ایک نیلے رنگ کی تختی ملے گی جس پر لکھا ہوگا کہ وہ سائنسدان اس گھر میں فلاں سال سے فلاں سال تک رہا اور اس گھر کو اس طرح محفوظ کیا گیا ہوگا کہ جیسے وہ سائنسدان ابھی چند لمحے کیلئے کہیں باہر گیا ہے اور اُس کا سارا سامان وہاں موجود ہے۔ہم نے دین کی احیاء کے نام پر سعودی عرب میں اپنے اکابرین کے سارے نشانات مٹادیئے۔صدیوں کا خزانہ چند دنوں میں برباد کردیا۔اس سے بڑی بدتہذیبی اور کیا ہوسکتی ہے۔

عہد حاضر میں بہت سے مسائل ایسے ہیں جو اجتہاد کا تقاضا کرتے ہیں۔علماء کرام کیلئے میں چند مسائل کی نشاندہی کر رہا ہوں۔

**مسلم اقلیتیں:** جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ان کا وہاں رویہّ کیا ہونا چاہیے۔ کیا وہاں کے قانون کی اطاعت ان پر فرض ہے۔ ہماری فقہہ اس وقت لکھی گئی ہے جب مسلمان غالب تھے۔اس لئے زیادہ تر مسلمانوں کو حاکم تصور کیا گیا ہے۔مسلمان بطورِ اقلیت کے فقہہ کا موضوع نہیں ہیں۔اس کا نقصان یہ ہے کہ اقلیتی مسلمان بھی اکثریتی ذہنیت کا شکار ہیں۔جس

سے بہت سنجیدہ مسائل پیدا ہوئے اور ہو رہے ہیں۔خصوصاً یورپ امریکہ وغیرہ میں اس سوچ سے مسلمانوں اور اسلام سے متعلق منفی سوچ پیدا ہو چکی ہے۔بی بی سی ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام میں حزب التحریر کے سابق سربراہ جناب عمر بکری صاحب کا ایک انٹرویو آیا جس میں اس نے کہا کہ یہ میرے ایمان کا حصہ ہے کہ میں 10 ڈاؤننگ سٹریٹ (برطانوی وزیراعظم کا گھر اور دفتر) پر اسلام کا جھنڈا لہراؤں، یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا یہ اسلام ہے اس لئے کہ اس طرح کے طرزِ عمل سے وہاں آباد مسلمان اقلیتوں کیلئے خطرناک مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔اگر یہ اسلام نہیں ہے تو ہمیں خواہ مخواہ اپنے لئے مسائل نہیں کھڑے کرنے چاہیں۔

**اقلیتوں کے مسائل:** مسلمان معاشروں میں اقلیتوں کے مسائل کیا ہیں۔ہماری فقہ کی کتب ابھی تک نئی فتوحات کے تناظر میں اقلیتوں کو دیکھتی ہیں۔کہ وہ ذمی ہیں۔ان کا لباس مختلف ہوگا۔وہ خراج دیں گے وغیرہ وغیرہ۔اس بات کو از سرِ نو دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کیا یہی اصول پاکستان جیسے ملک میں بھی لاگو ہوں گے۔عہد حاضر میں بین الاقوامی قانون نے اس ضمن میں بہت ترقی کر لی ہے۔مسلمان ممالک کے دساتیر (Constitutions) میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ برابری کی بنیاد پر ہے مگر ہماری مذہبی سوچ اس کا ساتھ نہیں دے رہی۔ہم جب اقلیتوں سے زیادتی کرتے ہیں تو قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہمارا تاثر (Image) بہت خراب ہوتا ہے۔نئے قومی و بین الاقوامی حالات و تناظر میں ہمیں اپنی فقہ پر از سرِ نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

**عورتوں سے متعلق قوانین:** عورتوں سے متعلق قوانین ایک خاص سیاسی و سماجی پس منظر میں بنے ہیں۔قومی اور بین الاقوامی قوانین نے پچھلے ہزار سال میں بہت ترقی کر لی ہے۔ہمارے مذہبی

قوانین نے ان کے مطابق اپنے آپ کو نہیں ڈھالا، تاثر یہی بن گیا ہے کہ عورت اسلام میں مرد کے برابر نہیں ہے۔اس کے حقوق برابر نہیں ہیں۔ یہ تاثر حالانکہ بالکل غلط ہے۔اسلام انسانی عظمت و برابری کا دین ہے۔ہمیں چاہیے کہ عورتوں کے متعلق قوانین کا جائزہ لیں۔خصوصاً دوسری شادی کے متعلق قوانین، گواہی سے متعلق قوانین، حدود کے قوانین وغیرہ۔اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کیا ہم نے اپنی عورت کو اپنے سماجی و مذہبی عمل سے بجا طور پر بے دخل کیا ہے یا یہ ہماری جذباتیت ہے؟

**معاشی معاملات :** معاشی معاملات میں بھی ہم قرون اوّل میں پھنسے ہوئے ہیں۔معاشی معاملات نے پچھلے چار سو سال میں اپنی شکل بالکل بدل لی ہے۔معاش نے نہ صرف مقامی سطح پر اپنی شکل بدل لی ہے بلکہ اس نے اب بہت حد تک بین الاقوامی جہت اختیار کر لی ہے۔معاشی نظام میں مسئلہ سود (Interest) کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ عہدِ حاضر کا لازمہ بن گیا ہے۔ہم اس کو حرام تو کہتے ہیں لیکن اس کے متبادلات پر توجہ نہیں کرتے یا پھر صرف حیلہ و بہانہ کر کے سود کو ہی حلال مان لیتے ہیں۔ یہ معاملہ بہت سنجیدہ سوچ کا تقاضا کرتا ہے کہ سود سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ مطلقاً (Absolutely) حرام ہے یا اس کی کچھ قسمیں حرام ہیں بین الاقوامی تجارت میں اس کا کیا رول ہے۔اگر حرام ہے تو جدید بینکاری کے نظام کو کیسے چلایا جائے۔مضاربہ کو کیسے چلایا جائے۔انشورنس و دیگر فنڈز کے مسائل کیسے حل کئے جائیں۔لوگوں سے بچتیں کیسے وصول کی جائیں۔ان کی حفاظت اور استعمال کیسے ہو۔روپے کی قدر میں کمی (Depreciation) سے لوگوں کو نقصان سے کیسے بچایا جائے۔غیر مسلموں سے لین دین کیسے ہو۔ان معاملات پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور کی ضرورت ہے۔

**قانون:** قانون خاص طور پر مسلمانوں کا شعبہ تھا۔عہدِ اوّل میں فقہ کی تدوین اس کا بین ثبوت ہے قانون ایک زندہ عمل ہے جو حیاتیاتی ارتقاء کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ جوں جوں زندگی پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی جارہی ہے۔قانون بھی پھیلتا جارہا ہے۔ہم ابھی تک ہزار سال پہلے والے قانونی پس منظر اور فریم ورک میں چل رہے ہیں جو عہدِ حاضر کیلئے بالکل ناکافی ہے۔ نئے دور میں بہت سے علوم نئے آئے ہیں۔زندگی کے بعض شعبوں میں بے انتہا ترقی ہوئی ہے۔لیکن ہم نے ان کو نظرانداز کیا ہے بینکنگ، انشورنس، مواصلات وغیرہ اس کی چند مثالیں ہیں۔ان اہم مگر پیچیدہ معاملات میں ہمارے پاس کوئی دینی راہنمائی میسر نہیں ہے بلکہ ظلم تو یہ ہے کہ ہم مسئلہ کو مسئلہ سمجھنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔

ہماری فقہ میں فوجداری قانون ایک ذاتی معاملہ ہے۔جدید اصولِ قانون نے اس ضمن میں اب بالکل دوسرا رویّہ اختیار کرلیا ہے۔دیوانی (Civil) معاملات انسان کے ذاتی معاملات ہیں جبکہ فوجداری (Criminal) معاملات اب فرد اور ریاست کے درمیان تصور کئے جاتے ہیں۔اس لئے اکبر اگر امام بخش کو قتل کرے تو جب مقدمہ چلتا ہے تو اسے سرکار بنام اکبر کے نام سے عدالت میں پکارا جاتا ہے۔یعنی کہ اکبر نے ریاست یا سوسائٹی کے خلاف جرم کیا ہے اور ریاست اپنے لئے اور امام بخش کیلئے اکبر سے انتقام لینا چاہتی ہے یا سزا دینا چاہتی ہے۔ ہماری فقہ جب تشکیل ہوئی ہے تب قانون میں یہ تقسیم نہ تھی۔اب یہ تقسیم مسلمہ ہے۔ہم جب قتل کو بھی ذاتی معاملہ سمجھتے ہیں تب ولی کو مجرم کی معافی کا حق مل جاتا ہے۔عہدِ حاضر کے کچھ علماء نے اس ضمن میں خاصی پیش رفت کی ہے لیکن اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اصولِ قانون کے اس مسئلہ پر سنجیدہ غور وخوض کیا جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ کیا عہدِ حاضر میں اس طرح کے کچھ فوجداری جرم فساد فی الارض کی شکل میں آتے ہیں جہاں ریاست بھی فریق ہے۔ یہ فرق بہت

اہم ہے۔اس اصول کے مان لینے سے ہمیں اپنے بہت سے قوانین بدلنے پڑیں گے۔اسلام ویسے بھی معروف پر بہت زور دیتا ہے۔قرآن اس سلسلے میں بہت واضح ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ کی تعلیمات اسی ضمن میں بہت مشہور ہیں۔

**دینی و دنیاوی تعلیم:** یہ پہلو بھی غور طلب ہے کہ کیا دینی اور دنیاوی تعلیم الگ ہے یا علم ایک وحدت ہے کیا سائنس کی تعلیم اتنی ہی لازم ہے جتنی کہ فقہہ کی، ہم دینی تعلیم کو ثواب اور دنیاوی تعلیم کو بعض اوقات گناہ اور بعض اوقات حقیر تر سمجھتے ہیں۔اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا ہے کہ ہمارے دیندار لوگ جدید تعلیم کے دائرے سے نکل گئے دوسرے صالح عناصر نے بھی ایک منفی ذہن بنالیا جس سے وہ ترقی سے مزید دور چلے گئے۔یہ ہم سب کیلئے حیات وموت کا مسئلہ ہے اور ایک کلی اجتہاد چاہتا ہے۔اس روشنی میں ہمیں نصابِ تعلیم بدلنا پڑے گا۔طرزِ تدریس بدلنا پڑے گا۔

یہ صرف چند امور ہیں جن کی طرف اصولاً توجہ دلائی گئی ہے۔اسلامی ممالک کی تنظیم (OIC) کو چاہیے کہ پہلے موضوعات منتخب کرے۔ان پر مختلف سوالنامے ترتیب دیے۔یہ سوالنامے اور موضوعات علماوفضلاء کی خدمت میں بھیجے۔علماوفضلاء سے ان کی تحریری مقالہ جات وصول کر کے ان کو باقی تمام علماء کو بھیجے۔تا کہ وہ دوسروں کی آراء سے مستفید ہوسکیں۔پھر ان علما کی کانفرنس بلائے تا کہ وہ اکھٹے بیٹھ کر باہمی مشورہ کرسکیں اور ایک مشترکہ یا جمہوری رائے قائم کرسکیں۔یہی کام مسلمان ممالک، رابطہ عالم اسلامی، موتمر عالم اسلامی یا بڑے دینی ادارے بھی کر سکتے ہیں۔

## (xii) دعوت

**ضرورت:** ہمارا دین اللہ عزوجل کا آخری پیغام ہے۔ جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا۔ سیدنا ابراہیم حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہ السلام سے ہوتا ہوا رسالت مآب ؐ پر مکمل ہوا اور قرآن نے واضح اعلان کر دیا کہ

> آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم
> پر اپنی نعمت تمام کر دی اور دین کی حیثیت سے اسلام کو تمہارے
> لئے پسند کر چکا (المائدہ۔3)

ایک طرف تو خالق کائنات کا یہ اعلان ہے کہ میں نے دین مکمل کر دیا ہے اور اس بات کو اب چودہ سو سال سے زائد ہو گئے ہیں۔ دوسری طرف زندگی اپنی رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے۔ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔ حیات وزمانہ آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ میرے اور آپ کے کہنے سے نہیں رکتا۔ حضرت علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

> تو اسے پیمانۂ امروز وفردا سے نہ ناپ
> جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اب دو اصول ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ دین مکمل ہو گیا ہے اور وہ رہتی دنیا تک کیلئے راہنمائی ہے۔ دوسرے یہ کہ زمانہ بدل رہا ہے۔ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تقاضے بھی بدل رہے ہیں ان دو اصولوں کی تطبیق اس طرح ہے کہ زندگی کی حرکت کا ساتھ دینے کیلئے دین نے دو عمل بتائے ہیں۔ اول اجتہاد اور دوسرے دعوت۔

دعوت کی ضرورت اس لئے بھی پیش آتی ہے کہ نئے نئے چیلنج سامنے آتے رہتے ہیں۔ مختلف زمانوں میں مختلف انداز سے دینِ اسلام کے قلب وجگر پر حملے ہوتے رہے ہیں۔

آجکل بھی جہاں عمومی فتنے کا زمانہ ہے وہاں نئی صلیبی یلغار ہو رہی ہے۔اس کے علاوہ مسلمانوں کی موجودہ حالت کی مسلسل بہتری کیلئے بھی یہ عمل لازم ہے۔

اجتہاد پر پہلے گزارشات ہو چکیں ہیں۔اس لئے اب میں اصلاح وتجدید کیلئے دعوت پر کچھ گزارشات کروں گا۔

**امامت:** قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کیلئے میدان میں لایا گیا ہے۔تم نیکی کا حکم دیتے ہو۔بدی سے روکتے ہو۔(آل عمران110)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ اب دنیا کی امامت اور راہنمائی پر ہم مامور ہیں۔اب اخلاق واعمال کے لحاظ سے ہمیں دنیا میں سب سے بہتر گروہ بننا ہے۔وہ تمام صفات پیدا کرنا ہیں جو امامت کیلئے ضروری ہیں۔ہم نے نیکی کو قائم کرنا ہے اور بدی کو مٹانا ہے۔یہ کام اب ہمیں سپرد کیا گیا ہے۔ہم پر لازم ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا،عدالت کا،شرافت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

قرآن میں ارشاد ہے

اسی طرح ہم نے تمہیں ایک امتِ وسط بنایا ہے۔تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔(البقرہ143)

یہ آیت امتِ محمدﷺ کی دنیاوی امامت کا اعلان ہے۔امتِ وسط سے مراد ایک ایسا

اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے جو عدل وانصاف اور درمیانے راستہ پر قائم ہو۔ جو دنیا کی قوموں کیلئے قائد کی حیثیت رکھتا ہو۔ امت وسط اس لئے بنایا گیا ہے کہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہو یعنی روزِ حساب نبی پاک گواہی دیں گے کہ انہوں نے حق وعدل کی تعلیم انسانوں تک پہنچا دی تھی اور اس کے بعد مسلمان پوری دنیا کے بارے میں گواہی دیں گے کہ ہم نے خدا اور نبی کا پیغام پوری انسانیت تک پہنچا دیا ہے (مودودی۔ البقرہ۔ حاشیہ 144)

یہ امامت اور دعوت دنیا کا بہترین کام ہے۔

''اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں
(السجدہ۔33)

یہ ایمان لانے سے آگے کا درجہ ہے اور اس سے زیادہ اعلیٰ کوئی درجہ نہیں ہے۔ اچھے عمل کرتے ہوئے لوگوں کو اپنے خالق کی طرف بلانا سب سے بہتر بات ہے۔

حکمت: دعوت حکمت کے ساتھ دینی ہے اور نصیحت کیلئے دینی ہے۔

''اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو۔ (النحل 125)

بے وقوفوں کی طرح دعوت نہیں دینی بلکہ دانائی کے ساتھ دینی ہے۔ موقع ومحل دیکھنا ہے۔ عقل استعمال کرنا ہے سننے والے کی نفسیات کا خیال رکھنا ہے۔ انسانی نفسیات کا خیال رکھنا ہے۔ عقل کے ساتھ ساتھ انسان کے اعلیٰ جذبات کو بھی مخاطب کرنا ہے۔

**دل سوزی:** دعوت دل سوزی سے دینی ہے۔ اصلاح کیلئے تڑپ ہونی چاہیے اور یہ تڑپ لوگوں کو محسوس ہونی چاہیے۔ یہی نبوی مزاج ہے۔ سورۃ الشعراء میں ارشاد ہے

(اے محمدؐ) شاید تم اس غم میں اپنی جان کھودو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ (آیت 3)

ایسا ہی مفہوم سورہ کہف (آیت 6) میں ہے۔ نبی کریم اپنی قوم کی گمراہی اور اس کی اخلاقی پستی کو دیکھ دیکھ کر کڑ ہتے تھے۔ اللہ عزوجل آپؐ کو تسلی دیتے تھے۔

**مقصد:** دعوت کو ہی زندگی کا مقصد بتایا گیا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے اعلان فرمایا کہ

میرا راستہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ پوری بصیرت کے ساتھ۔ (سورۃ یوسف 108)

زندگی کا مقصد عہدہ اور جائیداد نہیں بلکہ دعوت ہے۔ دعوت ہر مسلمان کا فرض ہے۔ یہی اس کی زندگی کا مقصد ہونا چاہیے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں تیرا نام رہے
کیا یہ ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے، جام رہے

کم از کم درجہ یہ ہے کہ ایک واضح جماعت یہ کام کرے۔

تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں۔ بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔ (آلِ عمران.104)

دعوت کا یہ عمل دوسرے کیلئے نہیں ہے۔ اس سے داعی کی اپنی اصلاح ہوتی ہے۔ دعوت کے مخاطبین کی اصلاح ہوتی ہے۔ دعوت کے مخاطبین مسلمان بھی ہوں گے اور غیر مسلم بھی ہوں

گے۔ نبی کریمؐ نے اس بات کو ایک خوبصورت مثال سے واضح کیا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس شخص کی مثال جو اللہ کی حدود پر قائم ہے اور اس شخص کی جو اللہ کی حدود میں پڑنے والا (یعنی اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والا) ہے۔ اس قوم کی سی ہے جو ایک جہاز میں بیٹھے ہوں۔ قرعہ سے جہاز کی منزلیں تقسیم کر لی جائیں۔ کچھ لوگ اوپر والی منزل میں ہوں اور کچھ نیچے والی منزل میں ہوں۔ جب نیچے والوں کو پانی کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ جہاز کے اوپر والے حصّے میں جا کر پانی لیتے ہیں۔ اگر وہ یہ خیال کر کے کہ ہمارے بار بار اوپر جانے سے اوپر والوں کو تکلیف ہوتی ہے اسلئے ہم اپنی نچلی منزل میں ایک سوراخ سمندر میں کھول لیتے ہیں تا کہ پانی لے سکیں۔ اگر اوپر والے نیچے والوں کو اس احمقانہ تجویز سے نہیں روکیں گے تو جہاز غرق ہو جائے گا اور دونوں گروہ ڈوب جائیں گے۔ اگر ان کو روکیں گے تو دونوں بچ جائیں گے (بخاری۔ترمذی)

اس حدیث سے یہ بات واضح ہے کہ مسلمانوں کی بقا اس میں ہے کہ وہ لوگوں کو برائی سے روکین وگرنہ وہ خود بھی مٹ جائیں گے۔ جب ہم دوسروں کو دعوت دیں گے تو دین سب سے پہلے ہماری اپنی زندگیوں میں آئے گا۔ ایمان کی بہار آئے گی۔

دین کا یہ وہ پہلو ہے جو ہم نے نظر انداز کر رکھا ہے۔ اس پر گہرے غور وفکر کی ضرورت ہے۔ جو لوگ دین کا کام کرتے ہیں۔ وہ احسان سمجھتے ہیں حکمت نہیں رکھتے۔ نصیحت نہیں کرتے، کلام میں نرمی نہیں ہے۔ جز وقتی کام کرتے ہیں۔ زندگی کا مقصد نہیں بناتے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم تمام بحیثیت قوم اس پر غور کریں خصوصاً علماء اور اہلِ فکر پر تو یہ انتہائی لازم ہے۔

## ساتواں باب

# اختتامیہ

انسانی زندگی میں ہر لمحہ تبدیلی آتی رہتی ہے۔حرکت،حیات کا بنیادی اصول ہے۔اسلام دین فطرت ہوتے ہوئے مثبت اور جامع تبدیلی کا دین ہے۔تبدیل نہ ہونے والی حقیقتوں پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ ہر لحظہ جدوجہد پر مجبور کرتا ہے۔

عہد اوّل میں مسلمانوں نے اپنے عہد کے ہر چیلنج کا مناسب جواب دیا بلکہ انسانیت کی فکری وعملی قیادت کی۔انسانی تہذیب پر بہت گہرے اور انمٹ نقوش چھوڑے مگر پھر جمود کا شکار ہو گئے۔وقت کی تبدیلی کا ساتھ نہ دے سکے اور زمانہ انہیں پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گیا۔اب ہم تین میں ہیں،نہ تیرہ میں۔غربت، جہالت، ذلت،مسکنت اور بے بسی ہمارا مقدر ہے۔

ہم پر لازم ہے کہ اس صورت حال کا ٹھنڈے دل سے گہرا مطالعہ کریں،خود احتسابی کے عمل سے گزریں۔فی الحال غیروں کی سازشوں کا رونا چھوڑ دیں اور اپنے گریباں میں جھانکیں کہ ہم سے کونسی غلطیاں ہوئی ہیں، ان کا ازالہ کیسے ممکن ہے۔ہم کیسے صاحبِ عزت ہو سکتے ہیں؟

اگر ہماری فکر اصلاح طلب ہے یا حالات کے مطابق تبدیلی چاہتی ہے تو ہمیں اپنی فکر جلد تبدیل کر لینی چاہیے۔اگر عمل اصلاح طلب ہے تو اس کی بہتری میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اس سے وقت بچے گا۔ہم نے فکر کی تبدیلی کے راستے ہی بند کر دیئے ہیں۔علم سوال سے بڑھتا ہے بحث سے بڑھتا ہے۔ہم نے سوال کرنے کو برا عمل بنا دیا ہے۔یہ اچھا عمل تھا جو ہماری جہالت سے برا عمل بن گیا ہے۔ہم نے تمام علماء کو رازی دوران اور غزالی زماں، شیخ طریقت

ورہبر شریعت جیسے القابات دے دیئے ہیں۔ یہ اتنے بھاری بھر القابات ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے ہم سوچنے کی اور تنقید کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔

قرآن کے ترجمے کو ہم نے کفر سمجھا۔ ہندوستان میں پہلا فارسی ترجمہ شاہ ولی اللہ نے اٹھارویں صدی میں کیا ہم نے تقریباً گیارہ سو سال اپنے لوگوں کو قرآن کے ترجمے سے محروم رکھا۔ کیوں محروم رکھا، کیا شاہ ولی اللہ نے کفر کیا؟ اگر ولی اللہ نے کفر نہیں کیا تو ہم نے پہلے ترجمہ کیوں نہیں کرنے دیا، یا کیوں نہیں کیا۔ ہم نے چودہ سو سال تک مفقودالخبر (جس کی خبر نہ ہو) خاوند کے بارے میں اپنی رائے نہ بدلی۔ چند سال پہلے اسلامی نظریاتی کونسل کی رائے کے بعد قانون بنا کہ یہ عمر سات سال کافی ہے۔ ستر یا اسی سال کی ضرورت نہیں۔ ہم نے یہ نہ سوچا کہ اتنی تو انسان کی عمومی طبعی عمر بھی نہیں ہے۔ دوسرے عورت کا کیا قصور ہے۔ کیا وہ انسان نہیں ہے؟ کیا اس کی خواہشات وضروریات نہیں ہیں؟ ان لاکھوں عورتوں کا کیا قصور تھا جن کو ہم نے صدیوں تک زندگی کی آسانی سے محروم رکھا اور اسلامی قانون کے نام پر ان کو جائز انسانی ضرورتوں کی تکمیل سے محروم رکھا۔ ہم نے سو سال تک لاؤڈ سپیکر کو حرام کہا اور اب اتنا حلال ہوا ہے کہ کوئی بھی عالم دین سپیکر کے بغیر تقریر نہیں کرتا۔ محلے میں سپیکر کی برکت سے کوئی مریض محفوظ ہے نہ کوئی طالب علم۔ اب سپیکر کیسے حلال ہو گیا اگر کل یہ حرام تھا۔ قرآن کی مشینی پرنٹنگ کو ہم نے کئی سو سال تک حرام کہا۔

وہی زمانے کی گردش پر غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمر جاوداں پیدا

اصل میں ہم تبدیلی کو قبول نہیں کرتے یہ بنیادی بات ہے کہ بہت سے احکام کی تعبیر کا بہت حد تک دارومدار عہد کے معاشی وسماجی نظریات پر ہوتا ہے۔ جب یہ نظریات بدلتے ہیں تو

تعبیر بھی بدل جاتی ہے۔اور عقل مندی یہ ہوتی ہے کہ تبدیلی کو جلد قبول کرلیا جائے۔بخوشی قبول کرلیا جائے اور ردِعملی (Reactionary) سوچ نہ اپنائی جائے۔اس سے وقت ضائع ہوجاتا ہے معاشرے اور دنیا میں منفی رائے بن جاتی ہے۔اسلام بدنام ہوتا ہے۔

یہ عجیب سوچ ہمارے مذہبی طبقے میں پائی جاتی ہے کہ مسلمانوں پر تنقید کو اسلام پر تنقید سمجھا جاتا ہے۔دین کی ایک رائے پر تنقید کو دین پر تنقید سمجھا جاتا ہے۔حالانکہ ان دونوں باتوں میں بہت فرق ہے۔زمین وآسمان کا فرق ہے۔اگر دین کی کچھ تعبیریں عہد حاضر کے مطابق نہیں ہے یا عہد ماضی میں بعض خاص حالات کی وجہ سے اختیار کی گئی ہیں تو تغیر کو سمجھا جائے۔محکمات پر قائم رہتے ہوئے تغیر کے اصول کو قبول کیا جائے۔بہتر تعبیر کو قبول کرلیا جائے۔ہم سمجھتے ہیں کہ غلط رائے پر قائم رہنا اسلام کی حفاظت ہے۔یہ سوچ بالکل غلط ہے۔اس سے اسلام کو نقصان پہنچ رہا ہے مثال کے طور پر اگر ہم نے عورتوں کی گواہی یا چار شادیوں میں کوئی افراط وتفریط کیا ہے یا ایک خاص مکتبہ فکر کی رائے قبول کررکھی ہے جو عہد حاضر کے مطابق نہیں ہے تو اس کا فوراً جائزہ لینا چاہیے یہی اسلام کی خدمت ہے۔یہی انسانیت کی خدمت ہے اگر حدود آرڈیننس میں کوئی غلطی ہے تو یہ حدود میں غلطی نہیں ہے۔دونوں میں فرق ہے۔

ہم بالکل ردِعمل کا شکار ہیں۔اگر کوئی اصلاح کی تجویز آتی ہے تو ہم اس کو فوراً مسترد کر دیتے ہیں بلکہ اسلام پر حملہ سمجھتے ہیں۔یہ اسلام کا دفاع ہرگز نہیں ہے۔آپ سب جانتے ہیں کہ آجکل کی فقہ حنفی وہ نہیں ہے جو امام ابوحنیفہ نے لکھی تھی بلکہ اکثر آراء ان کے شاگردوں (امام محمد۔امام یوسف اور امام زفر) کی ہیں۔چونکہ تعبیر کے اصول امام ابوحنیفہ والے استعمال کئے گئے ہیں۔اس لئے یہ بھی فقہ حنفی کہلاتی ہے۔اس لئے عہد حاضر کے علماء کو بھی حق ہے کہ انہی اصولوں کی روشنی میں نئی تعبیر کریں۔ہماری تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ہمارے علماء نے مختلف حالات میں آراء بدلی ہیں عہد اوّل میں عورتوں کا مسجد میں نماز پڑھنا قبول تھا۔بعد میں اس نیک عمل کو ہم

نے نامناسب سمجھا۔تین طلاقیں نامناسب تھیں۔بعد میں جائز قرار دے دی گئیں۔اب پھر صوبہ سرحد میں تحریک چل رہی ہے کہ طلاق مغلظہ (ایک وقت میں تین طلاقیں) کوممنوع قرار دے دیا جائے۔

ہم نے اسلام کو مسخ کر دیا ہے اسلام امن کا دین ہے ہم نے اس کوخون کا دین بنا دیا ہے۔اسلام شرفِ آدمیت کا دین تھا۔ہم اس سے دوسروں کی تذلیل کرتے ہیں۔اسلام انصاف کا دین تھا۔ہم اس کوظلم کیلیئے استعمال کرتے ہیں۔اسلام عورتوں کو بنیادی حقوق دینے والا دین تھا ہم اس سے عورتوں کوحیوان بنانے پر تلے ہیں۔اسلام انسانی ترقی کا دین تھا۔آج اس کو غربت کیلیئے استعمال کیا جاتا ہے۔

ہمارے عوام رسومات میں مست ہیں،حکمران عیاشی میں مصروف ہیں،اہلِ زر،زر میں ڈوبے ہوئے ہیں،دانش ور جاہلیت کے علمبردار ہیں،عالمی سطح پر ہماری داستان داستانوں میں نہیں ہے۔اب ہمیں مستی چھوڑنا ہوگی،غلامی سے نجات پانا ہوگی،خونِ جگر جلانا ہوگا،اعتمادِ ذات حاصل کرنا ہوگا،ترقی کرنی ہوگی۔

اصلاح کی ذمہ داری کس پر ہے؟ ہم سب پر ہے۔ہم نے اپنی صورت آپ مسخ کر لی ہے۔ان حالات میں علماء کرام پر سب سے زیادہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے اسلیئے کہ وہ دین کی اعلیٰ تعلیمات کے علمبردار ہیں۔وہ مسلمانوں کی اخلاقی حالت کے نگہبان ہیں۔وہ اسلام کی شاندار روایات کے امین ہیں۔اس طبقے نے ابوحنیفہ،ابن حنبل،ابن تیمیہ،غزالی،الف ثانی،ولی اللہ کو پیدا کیا ہے۔اس لئے میری رائے میں علماء کو چاہیے کہ سر جوڑ کر بیٹھیں حالات کی سنگینی کا اندازہ لگائیں اس کے حل کا مناسب راستہ تجویز کریں،اسلام کی صحیح تعلیمات بیان کریں،تبدیلی کا ہراول دستہ بنیں نئی نسل کو سنبھالیں۔

یہ سب کچھ ممکن ہے۔ مایوسی کفر ہے، تبدیلی حقیقت ہے، قوموں میں عروج و زوال آتا رہتا ہے۔ ہمارا زوال عروج بن سکتا ہے۔ اس کے لئے ہمیں محنت کرنی ہے، اور غیر معمولی محنت کرنی ہے۔ اپنی ذات میں اور اپنی سوسائٹی میں انقلاب لانا ہے اور مکمل انقلاب لانا ہے کہ انقلاب سے زندگی ملتی ہے، انقلاب سے قومیں باقی رہتی ہیں۔ ہمیں نقش و نگارِ دیر سے ہاتھ اٹھانا ہے۔ مردہ دلوں کو زندہ کرنا ہے۔ ذوقِ یقیں پیدا کرنا ہے۔ اپنی خودی میں ڈوب جانا ہے۔ خونِ جگر جلانا ہے۔ آشفتہ سری کرنی ہے، تب جا کے یہ خواب حقیقت بنے گا:۔

آبِ روانِ کبیر ! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

عالمِ نو ہے ابھی پردہ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحرِ بے حجاب

# کتابیات


| مصنف | کتاب |
| --- | --- |
| ابن جوزی | تاریخ عمر بن خطاب |
| ابن اثیر | الکامل |
| ابن کثیر | البدایہ والنہایہ |
| امام مسلم قشیری | صحیح مسلم |
| محمد القزوینی | ابن ماجہ |
| امام احمد بن حنبل | مسند احمد بن حنبل |
| ابن کثیر | تفسیر ابن کثیر |
| امام بخاری | صحیح بخاری |
| حافظ ابنِ قیم | زاد المعاد |
| وحید الدین خان | فکر اسلامی |
| علامہ شاطبی | الموافقات |
| ابوالحسن ندوی | انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر |
| سیّد ابوالاعلیٰ مودودی | تفہیم القرآن |
| ڈاکٹر حمید اللہ | خطباتِ بہاولپور |
| تفہیم القرآن | ابوالاعلیٰ مودودی |
| ضیاء القرآن | پیر کرم شاہ بھیروی |
| تفسیر مظہری | قاضی ثناء اللہ پانی پتی |

# REFERENCE


| | |
|---|---|
| Russel, Bertrand | The Impact of Science on Society |
| Russel, Bertrand | A History of Western Philosophy |
| Hitti, Phillip, K. | History of Arabs |
| Sharif, S. M. | History of Muslim Philosophy |
| Briffault | Making of Humanity |
| Asad, Muhammad | Islam at Cross Roads |
| Asad, Muhammad | The Meaning of Quran |
| Iqbal, Muhammad | The Reconstruction of Religious Thought in Islam |

بیرسٹر ظفر اللہ خان نے ابتدائی دینی و دنیاوی تعلیم صوفیائے کرام کے شہر ملتان میں حاصل کی۔ ایف اے اور بی اے کے امتحانات پرائیویٹ طور پر ملتان ایجوکیشن بورڈ اور ملتان یونیورسٹی سے امتیازی پوزیشنوں میں پاس کیے۔ قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم ایس سی (بین الاقوامی تعلقات) کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ کچھ عرصہ تک انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں درس وتدریس کے شعبے سے منسلک رہنے کے بعد 1987ء میں انہوں نے سول سروس آف پاکستان کے ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ میں شمولیت اختیار کرلی۔ 1997ء میں سٹی یونیورسٹی لندن سے ایل ایل بی کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ یونیورسٹی آف ویسٹ آف انگلینڈ، برسٹل (برطانیہ) سے 1998ء میں قانون میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ حاصل کیا اور لنکنز ان (لندن) سے بارایٹ لا کیا۔ آج کل وہ قانون کے شعبے سے منسلک ہیں۔ اُن کی کتاب 'Human Rights' اس موضوع پر شائع ہونے والی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

ISBN 969-8866-00-0